معرفت کے موتی

حصّۂ دوم

پس منظر

امامِ عالیمقامؑ کے روحانی اور عرفانی معجزات

علاّمہ نصیر الدّین نصیر ہونزائی

معرفت کے موتی

حصّہ دُوم

(پس منظر)

امامِ عالیمقامؑ کے رُوحانی اور عرفانی معجزات

بقلمِ علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی
ریسرچ ایسوسی ایٹ یونیورسٹی آف مونٹریال کینیڈا

شائع کردہ:-
خانۂ حکمت — اِدارۂ عارف

۱۷-بی، نورؔ ویلا
۲۶۹- گارڈن ویسٹ
کراچی-۳ (پاکستان)

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱-	تعارف	۴
۲-	صُورتِ رحمان	۱۱
۳-	بنیادی اور آخری حقائق	۲۲
۴-	عالمِ شخصی	۳۱
۵-	قرآنِ حکیم میں لفظِ "نعمت"	۴۰
۶-	" " " " امین"	۴۹
۷-	قصۂ مریم سے متعلق ۲۰ سوالات	۶۰
۸-	رُوحانیت اور موسیقی	۷۴
۹-	مذہب اور سائنس: (۱) کراماً کاتبین	۸۹
۱۰-	رُوح ایک انتہائی پیاری حقیقت	۹۷
۱۱-	"رُوح — ایک پیاری حقیقت" کے مضمون سے متعلق سوالات	۱۱۱

حرفِ آغاز

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ ۔

بندۂ عاجز و ناتوان ، خاکپائے مومنان ، صدقۂ رُوحِ دوستان ، یعنی نصیرِ حقیر یوں عرض پرداز ہے کہ کاش اِس حصُولِ نعمت اور شکر گزاری کے موقع پر یہ ناچیز غلام طوفانی گریہ و زاری کے عالم میں بحضورِ خُداوندِ قدوس ہمہ وقت سربسجُود ہو سکتا ، جبکہ وہ مُنعم و مُحسن دائما" احسان ہی احسان فرما رہا ہے ، اور خاص کر آج کی نعمت بڑی عجیب و غریب اور عظیم ہے ، یہ رُوحانی نعمت اِس کتاب کی شکل میں ہے ، جو آپ کے سامنے ہے ، جس کا نام " معرفت کے موتی " حِصّۂ دُوم ہے ، صرف یہی نہیں ، بلکہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی بنام " پرلز آف معرفت " پارٹ سیکنڈ ، میرے رُوحانی دوستوں نے بڑی عُمدگی سے تیار کیا ہے ، اُن کے لئے میری رُوح بطریقِ حکمت فدا اور قربان ہو !

امامِ اقدس و اکرم صلوات اللہ علیہ کے جشنِ سیمین کا سال سراسر

رحمتوں اور برکتوں سے مملو تھا، اس میں جماعتی اور انفرادی پیش رفت و ترقی لازمی تھی، اِس لئے ہر جماعتی ادارے نے اس ہمہ گیر و ہمہ رس پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حِصّہ لیا، اور ہر فرد نے دل کھول کر خدمت کی، اور نتیجے کے طور پر سب کے سب دینی دولت سے مالا مال ہوگئے، اگر یہ خاکسار یہاں اپنی بات بھی کرے تو شاید بیجا نہ ہوگا، چنانچہ مومنین کی دُعا اور تائیدِ ایزدی کی دستگیری سے اِس بندۂ کمترین کو کراچی، ہونزہ اور لندن میں امامِ زمان ہادئ برحق صلوات اللہ علیہ وسلامہ کا حکمت آگین دیدار حاصل ہُوا، جس کے نتیجے میں دورۂ لندن کے چالیس دنوں میں نورِ امامت نے آسمانِ بارِندہ (۱۱/۵۲) کی مرتبت میں علم و حکمت کی ایک زبردست بارش برسا دی، جس کی شدّت سے بعض دفعہ اِس غریب اور چند خاص احباب پر کپکپی کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی، امامِ زمانؑ کا یہ عقلی اور علمی معجزہ ہمارے عالی قدر دوستوں نے بھی دیکھا اور ہم سب نے شکر گزاری کے آنسو بہائے، الحمدُ للّٰہ ربّ العالمین۔

یہاں ایک بڑا اہم سوال ہے کہ اِس مادی ترّقی کے طوفان خیز دور میں جبکہ چشمِ اہلِ جہاں ظاہری رنگینیوں سے خیرہ ہو رہی ہے، ہم کس درجہ یا کِس نوعیّت کے علم کے سہارے اپنے مقدّس عقیدے کو محفوظ و سلامت رکھ سکتے ہیں؟ آیا نورِ خُداوندی کے خزائن میں کوئی ایسا علم نہیں ہے، جو انقلابی طاقت کا حامل ہو، جس کی پُرکشش نورانیت میں ہم دینِ اسلام کی رُوح و رُوحانیت کو بخوبی سمجھ سکیں، اور عقیدے کی

حفاظت کریں؟ اس کا جواب نفی میں نہیں بلکہ اثبات میں ہے۔

حضرت مولانا امام سُلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے ایک ارشاد میں ذُوالفقار کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اِس کا مفہوم یہ ہے کہ امامِ عالیمقام ایک دَور کے بعد آہنی ذُوالفقار کی بجائے عِلمی ذوالفقار کے اِستعمال کو پسند فرماتے ہیں، اور یہ سچ ہے کہ اِس زمانے میں نورِ امامت نے بطورِ خاص ایک عِلمی قیامت برپا کردی ہے، جو ظاہراً و باطناً اثر انداز ہو رہی ہے، جس کی ایک مثال وہ تصوّرِ آفرینش ہے، جو حضرت امامِ عالیمقامؑ نے پیش کیا ہے، دُوسری مثال حقیقتِ واحدہ (MONOREALISM) ہے، اِس نوعیت کے تصوّرات میں عِلمی قیامت کا اِنقلابی اثر پنہاں ہے اور ان تمام چیزوں کا تعلق رُوحانی قیامت سے ہے۔

ہاں یہ دُرست ہے کہ ہر انسانی رُوح لاتعداد ذرّات پر مبنی ہے، کیونکہ ساری حکمت اِسی میں ہے کہ رُوح اپنے اجزاء کا مجموعہ ہو تاکہ یہ نفسِ کلّی کی مثال قرار پائے، ساتھ ہی ساتھ اس کی کثرت سے عالمِ صغیر کی تکمیل ہو جاتی ہے، اور ان تمام ذرّات کی باہمی وحدت نہ صرف اِنسان کی "انا" کہلاتی ہے، بلکہ توحیدِ باری تعالیٰ یا یک حقیقت کی مثال بھی بن سکے، چنانچہ میری رُوح کا ہر ذرّہ کسی خارجی وجُود کا نمائندہ ہے، سو کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں، جس کی نمائندگی اِن ذرّاتِ رُوح میں نہ ہو، تاہم قانُونِ اختصاص کے بموجب میری

رُوحانی ہستی میں وہی ذرّات زیادہ سے زیادہ مثبت کام کرتے ہیں، جو میرے عزیزوں سے مربوط ہیں۔

خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف سے منسلک حضرات مجھے بحد عزیز ہیں، کیوں نہ ہوں جبکہ وہ سرچشمۂ (حقیقی) محبّت یعنی امامِ زمانؑ اور پیاری جماعت کی ایک ایسی خدمت میں لگے ہوتے ہیں، کہ اگر وہ صحیح معنوں میں عمل میں آئی تو وہ ہمہ رس بھی ہے اور ہمہ گیر بھی، وہ حال کے لئے بھی ضروری ہے اور مستقبل کے لئے بھی، اور یہ تمام خدمات میں سے بہترین خدمت علمی صورت میں ہے۔

اِنسان کی دینی اور دُنیوی زندگی سے تعلق رکھنے والی تمام چیزیں سب کی سب اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں، ان میں کوئی شے غیر ضروری نہیں، لیکن دینی علم سب سے بڑھ کر ضروری ہے، کیونکہ دُنیا و مافیہا دین کی خاطر بنائی گئی ہے، اور دین کا مقصد علم کے بغیر پُورا نہیں ہو سکتا ہے، اِس سے یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ اگرچہ دین میں طرح طرح کی خدمات ضروری ہیں، تاہم علمی خدمت بدرجۂ انتہا ضروری ہے۔

دل چاہتا ہے کہ میں اِس کتاب کی خُوب تعریف و توصیف بیان کروں، لیکن اِس میں ایک بات کا خوف دامنگیر ہوتا ہے، وہ یہ کہ کہیں کوئی یہ گمان نہ کرے کہ یہ بندہ اِسی صورت میں خودستائی کرنا چاہتا ہے، مگر عقل والے جانتے ہیں کہ کوئی بھی حقیقی درویش اصولاً اپنی تعریف نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کی کوئی منطق نہیں بنتی ہے کہ کوئی سائل درویش

بادشاہِ غنی کے درِ دولت پر "شیئاً للّٰہ" کی صدا لگاتے ہوئے خود کو امیر ظاہر کرے
یا لوگوں کے پاس صاحبِ دولت ہونے کا دعویٰ کرے، لوگ کیسے باور
کر سکتے ہیں کہ ہر وقت دریوزہ کرنے والا بھکاری بحقیقت امیر ہے، سو اس
مثال سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اِس کتاب میں جو معجزاتی درجے
کا علم و حکمت ہے وہ درحقیقت آلِ محمدؐ و اولادِ علیؑ یعنی امامِ زمانؑ کے
زندہ معجزات میں سے ہے۔

کتابِ ہذا کے اِس تعارف میں اگر لندن کے احباب و اعزّہ
کا ذکرِ جمیل نہ کیا جائے تو یقیناً بڑی ناشکری ہوگی، جبکہ وہی حضرات
اِس کتاب کی تصنیف کے اصل سبب اور قوی محرّک ہیں، انہی ارضی
فرشتوں نے میری تھکی ہوئی ذہنی صلاحیتوں کو پھر سے تازہ اور آمادہ کر دیا،
اور میری ہستی کے اندر اور باہر علم کی تشکیل کی خاطر شب و روز کام کیا، وہ
ان کی یادِ الٰہی انتہائی شیریں ہے، وہ ان کی بیحد میٹھی مناجات نغماتِ داؤدی
کی مثال ہے، وہ اُن کی پُرسوز دُعا عبادت کا مغز ہے، وہ ان کے عاشقانہ
آنسوؤں کے موتی انمول ہیں، وہ اُن کا عشقِ مولا شرابِ جنّت کی طرح مسرت انگیز
ہے، وہ ان کا دریائے بیخودی میں ڈوب جانا بڑا عجیب و غریب ہے،
وہ ان کی علم دوستی بڑی دلکش ہے، وہ ان کی عاجزی سب کے لئے
قابلِ تقلید ہے، وہ ان کی سخت محنت و جانفشانی کامیابی کا زرّین اصول
ہے، وہ ان کی وفاداری برائے امامؑ سرمایۂ ایمان ہے، وہ ان کی
عملی اخوّت و یگانگت نمونۂ یک حقیقت (مونوریالزم) ہے، وہ ان کا

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

جذبۂ خدمت اور اور اس کا عمل بڑا سبق آموز ہے، اور وہ ان کی قلمی خدمت یقیناً ہمہ رس ہے ۔ یہ ساری چیزیں ایک ایک ہو کر میرے دل و دماغ کو چھوتی رہتی ہیں، اور میرے چہرۂ خیال کو اُن عزیزوں کی طرف متوجّہ کر دیتی ہیں ۔

بالآخر یہ خادم جناب فتح علی حبیب صدرِ خانۂ حکمت مرکزِ کراچی اور جناب محمد عبدالعزیز صدرِ ادارۂ عارف مرکزِ کراچی کا شکر گزار اور ممنون ہے، نیز دونوں پریذیڈنٹ کے نائب صدر صاحبان، سیکریٹری صاحبان، دیگر عملداران اور ارکان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے کہ لندن کا ہو یا کسی اور مقام کا، کوئی بھی کامیاب دَورہ ان کے مشورہ اور پُشت پناہی کے بغیر ممکن نہیں، اسی خلوص و جذبے سے میں مشرق و مغرب کی اپنی تمام شاخوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ اعتماد و یقین کے ساتھ اِس علمی خدمت کے منصوبے میں شریک ہیں، اور کئی طرح کی قربانیاں دے رہے ہیں، بحکمِ حدیث شریف: "اَلدِّیْنُ نَصِیْحَۃٌ = دین کا مفہوم خیر خواہی ہے"۔ ہر مومن کے دل میں نیک نیّتی، خیر خواہی اور اخلاص ہونا چاہیئے اور اسی کے مطابق عملی حرکت بھی ضروری ہے مگر اس کی کامیابی اور اجر و صلہ خُداوند تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے، لہٰذا انتہائی عاجزی سے دُعا ہے کہ پروردگارا! ہم سب کو ایسی اعلیٰ توفیق عنایت فرما کہ اس کی بدولت ہم عالمِ اِسلام اور جماعت کی کچھ علمی خدمت کر سکیں، خُداوندا ہم اِس کے

قابل نہیں ہیں، اِس لئے تو ہی اپنی عنایتِ بے نہایت سے ہمیں مدد دے! بحقِّ محمدؐ و آلِ محمدؑ۔

سوموار ۶/ذی القعد ۱۴۰۳ھ / ۱۵/اگست ۱۹۸۳ء سالِ خوک

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

کراچی

صورتِ رحمان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط حضرتِ انسان جہاں انسانِ کامل کی مرتبت میں بحقیقت بنی آدم کہلاتا ہے، اور جہاں وہ اُن پُر حکمت قرآنی اشارات کا مصداق ہے جو اولادِ آدم کی کرامت و فضیلت کے بارے میں فرمائے گئے ہیں وہاں وہ ظاہراً و باطناً رحمانی صُورت رکھتا ہے، کیونکہ خدائے رحمان نے حضرت آدم علیہ السّلام کو اپنی رحمانی صُورت پر پیدا کیا تھا، اور اگر یہ بنیادی حقیقت نہ ہوتی، تو بموجب قانُونِ فطرت وجُودِ آدمؑ کے ساتھ رُوحِ خُداوندی کا کوئی رشتہ نہ بنتا، جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ (۱۵/۲۹) تو جس وقت میں اس کو ہر طرح سے دُرست کر چکوں اور اس میں اپنی رُوح (نور) پھُونک دوں تو تُم سب کے سب اِس کے سامنے سجدہ میں گر پڑنا۔ اِس سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے، کہ حضرت آدمؑ کی صُورت ایک وجہ سے رحمان کی صورت ہے، اگرچہ دُوسری وجہ سے خُدا ہر چیز سے پاک و برتر ہے۔

ارشادِ نبوی ہے کہ : خلق اللہ آدم علیٰ صُورَتہ الرَّحمٰن؛ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی رحمانی صُورت پر پیدا کیا۔ صُورت کے معنی یہاں بظاہر چہرۂ جسم وجان ہیں اور بباطن اُس کا مطلب وسیلۂ معرفت ہے، جس میں سب کچھ ہے، اور ابنِ آدمؑ میں یہ مقدّس فطری میراث یا خصوصیت اِس طرح ہے کہ بشری شکل وصُورت کے حسن وجمال کا آغازِ ارتقاء جسم سے ہو کر رُوح کی درجۂ کمال تک پہنچ جاتا ہے، چنانچہ قرآنِ حکیم میں فرمایا گیا ہے : ھوالذی یُصَوِّرُکُم فی الارحام کیف یشاءُ (۳/۶) وہی تو وہ (خدا) ہے جو ارحام (بچّہ دانیوں) میں تمہاری صُورت جیسی چاہتا ہے بناتا ہے۔ یعنی انسانی شکل وصُورت کی تخلیق وتکمیل کا سِلسلہ ماں کے پیٹ سے شروع ہو جاتا ہے، پھر نوجوانی ہی میں ہر آدمی کی ایک پُرحکمت زندہ (رُوحانی) تصویر بنائی جاتی ہے، اگر شخص حقیقی معنوں میں فرمانبردار رہے تو اُس کی یہ باطنی صُورت بحکم : صِبْغَۃَ اللہ (۲/۱۳۸) بشری تجمّل سے گزر کر خُدائی حسن وجمال کے مقدّس رنگ میں رنگین ہو جاتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ پاک نے اِنسانی خوبصُورتی کے عکسِ رُوحانی ہونے کا اور اِس میں اضافہ وترقی ہونے کا تصوّر پیش کیا ہے، اور وہ فرمانِ الٰہی یہ ہے : وَصَوَّرَکُم = اور خُدا نے تمہاری صُورتیں بنائیں، اِس میں جسمانی صُورت کا ذکر ہے جو ماں کے پیٹ سے شروع ہو جاتی ہے، فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ = پھر اُس نے تمہاری صُورت کو

بہترین بنا دیا، یعنی اسے مقامِ رُوحانیت پر جلوۂ نُورانیت سے مستفیض کر دیا، وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ (۶۴/۳) اور اسی کی طرف لوٹ کر جاتا ہے، اِس کے معنی ہیں کہ یہ ساری ترقی جو ظاہر سے لے کر باطن تک ہوتی ہے خُدا کے حضور جانے کے لئے ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنٰکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰکُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (۷/۱۱) اِس میں شک ہی نہیں کہ ہم نے تُم کو پیدا کیا (یعنی جسمانی تخلیق مکمّل کر دی) پھر تمہاری رُوحانی صُورتیں بنائیں، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ تم سب کے سب آدم کو سجدہ کرو۔ اس آیۂ کریمہ میں بطریقِ حکمت تمام آدموں یا انسانوں کی جسمانی تخلیق اور رُوحانی صورت کی تکمیل کا یکجا ذکر فرمایا گیا ہے، اور اس میں سب پر یکساں احسان ہونے کا اشارہ ہے، اور ہر حالت میں رُوحانی صُورت کی تکمیل کے بعد خُدا فرشتوں سے فرماتا ہے کہ آدمؑ کو سجدہ کرو، جس سے رُوحانی صُورت کی معنویت و اہمیّت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

آپ قِصّۂ مریمؑ میں اِس نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں کہ رُوح القدس یعنی جبرائیلؑ جس کو رُوحِ خُدا کے عظیم ٹائٹل سے نوازا گیا ہے وہ ایک کامل اور مکمّل اِنسان کی صُورت میں حضرت مریمؑ کے سامنے ظاہر ہو جاتا ہے (۱۹/۱۷) پس اگر ہم رُوحِ خُدا وندی یا نورِ خدا وندی کی اُس مثال کو ایک اعتبار سے صُورتِ رحمان اور دُوسرے اعتبار سے صُورتِ انسان قرار دیں تو اس میں کون سی منطق خلافِ قرآن اور غلط ہو سکتی ہے،

اور اگر اِس قِصّہ کے مطابق رُوحِ خُدا کا اِنسانی شکل اختیار کر لینا ایک قرآنی حقیقت ہے تو یہ بھی بالکل دُرست ہے کہ حضرت آدمؑ اپنے زمانے میں صورتِ رحمان تھے، کیونکہ آپ میں بھی خُدا کی وہی رُوح تھی، جس نے مُستقل طور پر آپؑ میں اِنسانی صُورت اختیار کر لی تھی، وہی رُوحِ قدسی جو بعد میں مریمؑ کے سامنے آئی، اور ان کے کانوں سے داخل ہُوئی، اور وہی جو حضرتِ عیسیٰؑ کی ظاہری اور باطنی صُورت میں تھی۔

اِس ربطِ حکمت سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ہر پیغمبر اور ہر امام یقیناً صُورتِ رحمان ہُوا کرتا ہے، کیونکہ جو خُدائی رُوح حضرتِ آدمؑ کی پیشانی میں جلوہ گر تھی، اسے ہم رُوحِ خُدا کہیں یا نورِ خُدا، اِس میں کوئی فرق نہیں، مگر امرِ واقعی یہ ہے کہ اس کا سب سے اہم مقصد بنی نوعِ انسان کی ہدایت کرنا تھا، لہٰذا خُداوندِ عالم نے اپنی پاک رُوح کو ہمیشہ کے لئے سلسلۂ ہدایت سے وابستہ کر دیا ہے، پس زمانے کا ہادیٔ برحق خُدا کی رُوح اور صُورتِ رحمان کا درجہ رکھتا ہے۔

سوال: صُورتِ رحمان کی اِس مثال میں لفظِ "صُورت" کو اتنی بڑی اہمیّت کیوں دی گئی ہے؟

جواب: کیونکہ یہ چہرۂ خُدا کے معنی میں آیا ہے، جس کا دُوسرا لفظ قرآن میں "وجہ اللہ" ہے، جو رُوحانیت کا انتہائی عظیم مرتبہ اور قرآنِ حکیم کا سب سے آخری موضوع ہے، اور اِس حقیقت کی دلیل یہ ہے کہ عقلی یا رُوحانی طور پر فنا ہو جانے کے لئے کوئی درجہ نہیں، مگر

وجہ اللہ ہے، جیسا کہ خدا کا کلام ہے: کُلُّ شیءٍ ھالِکٌ اِلّا وجہہٗ لہ الحکم وَاِلیہِ ترجعون (۲۸/۸۸) چہرۂ خدا کے سوا ہر چیز ہلاک ہو جانے والی ہے، حکم اُسی کا ہے اور تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

اِس حقیقت کی دُوسری دلیل یہ ہے: کُلُّ مَنْ علیہا فانٍ وّیبقٰی وجہ ربکَ ذُوالجلالِ والاکرام (۵۵/۲۶-۲۷) جو مخلوق اُس (زمینِ ظاہر اور زمینِ رُوحانیت) پر ہے وہ سب فنا ہو جانے والی ہے مگر تمہارے پروردگار کا چہرہ جو جلالت و کرامت والا ہے باقی رہے گا۔ اِس کی ایک ظاہری مثال قصّۂ حضرت نوح علیہ السّلام سے مل سکتی ہے، کہ آپؑ اپنے زمانے میں چہرۂ خدا تھے، لہٰذا اُس وقت کے فرمانبردار مومنین آپؑ سے وابستہ ہو کر جلالت و کرامت کے ساتھ زندۂ جاوید ہو گئے، اور جو لوگ نافرمان تھے، وہ رُوحانی موت سے ہمیشہ کے لئے مر گئے، اور عقل والے جانتے ہیں کہ طوفان اور ہلاکت صرف زمانۂ نوحؑ کے لئے خاص نہیں، یہ تو پوشیدہ پوشیدہ ہر زمانے میں آتا رہتا ہے۔

انبیاء و ائمّہ علیہم السّلام کے عالمِ شخصی کو عالمِ ذرّ بھی کہا جاتا ہے، جس میں ازل سے لے کر ابد تک جملہ واقعات و حالات فعلاً موجود ہیں، تاکہ اہلِ رُوحانیّت کے لئے عملی تاویل اور کامل معرفت کے وسائل مہیّا ہوں، منجملہ اس میں لازمی طور پر انفرادی قیامت بھی برپا ہو جاتی ہے، جس میں اجتماعی قیامت کا مکمل نمونہ پایا جاتا ہے، وہ قیامت ہو بہو

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

واقعۂ آدمؑ بھی ہے اور طوفانِ نوحؑ بھی، غرض وہ ایک ایسی جامع الجوامع مثال ہے کہ اس کے احاطے سے کوئی علمی اور عرفانی شے باہر نہیں، چنانچہ وہاں بحکمِ خداوند تعالیٰ جب اسرافیلؑ صور پھونکتا ہے، تو اس کی معجزاتی آواز سے تمام لوگ خواہ مُردہ یا زندہ بصُورتِ ذرّاتِ لطیف آن حاضر ہو جاتے ہیں، پھر اِس سلسلے کے ایک مرحلے میں جا کر چہرۂ خُدا (ہادئ زمان) کے سوا سب فنا ہو جاتے ہیں، اور یہ فنا دو طرح کی ہوتی ہے: فنا برائے فنا، اور فنا برائے بقا، اِس کی مثال کسی پُرانی عمارت کو گرا دینے کی طرح ہے، کہ اِس کے گرا دینے کا مقصد یا تو ختم ہی کر دینا ہوتا ہے یا از سرِ نو تعمیر کرنا۔

سوال: اِس میں کیا حکمت اور کیا راز ہے کہ قرآنِ حکیم میں جہاں سب لوگوں کے فنا یا ہلاک ہو جانے کا ذکر فرمایا گیا ہے وہاں چہرۂ خُدا کا تذکرہ بھی موجُود ہے؟

جواب: فنائے مخلوق اور چہرۂ خُدا کا یکجا ذکر اِس لئے ہے کہ جس طرح کسی شخص کی پہچان اس کے چہرے سے ہوتی ہے، اِسی طرح خُداوند کریم کی معرفت (پہچان) بھی اِس کے چہرے سے حاصل ہو سکتی ہے، چنانچہ ذاتِ سُبحان نے ہر پیغمبر اور ہر امام کو اپنا پاک چہرہ قرار دیدیا، کیونکہ معرفتِ توحید انہی پاکیزہ ہستیوں کے وسیلۂ ہدایت کے بغیر کسی کو کہیں سے مل نہیں سکتی تھی، سو یہی سبب ہے کہ لوگوں کو قیامت میں چہرۂ خُدا کے حضور میں حاضر کیا جاتا ہے، تاکہ اُن سے متعلقہ سوالات

کئے جائیں اور فیصلہ اِس حقیقت کی روشنی میں ہو۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے مُبارک ناموں میں سے ایک "البیّنۃ ۱/۹۸" بھی ہے، جس کے مطابق آپؐ ہی معجزہ اور دلیلِ روشن ہیں، اور ہر زمانے کا امامؑ انہی معنوں میں خلیفۂ رسُولؐ ہے، اب قرآنِ حکیم (۸/۴۲) میں ذرا غور سے دیکھ لیجئے، کہ زمانۂ نبوّت کے بعض لوگ جسمانی طور پر مرنے سے قبل کس طرح دلیل سے یعنی عقل کی نظر میں مرچکے ہوتے تھے، اور بعض دوسرے لوگ کس طرح اسی قانونِ عقل کے مطابق صحیح معنیٰ میں زندہ ہو چکے ہوتے تھے، پس یہی مثال قیامت کے لئے بھی ہے کہ جو شخص دُنیا میں چہرۂ خدا کی نافرمانی سے بحدِ قوّت مر گیا ہو اس کو دائمی فنا کی غرض سے فنا کر دیا جائے، اور جو بندہ چہرۂ خُدا کی فرمانبرداری سے بحدِّ قوّت حیاتِ رُوحانی پا چکا ہو اسے ابدی بقا کے لئے فنا کر دیا جائے، اور ان دو حالتوں کی بُنیاد چہرۂ خُدا سے لوگوں کی دُشمنی اور دوستی ہے۔

سوال: مسلمین اور مومنین یا اہلِ نجات کو چہرۂ خُدا میں کس طرح فنا فی اللہ و بقا باللہ کا انتہائی عظیم درجہ حاصل ہو جاتا ہے؟

جواب: یہ سب سے بلند ترین مرتبہ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی سے حاصِل ہو سکتا ہے، چُنانچہ حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یَا بنی اٰدم اطعنی اجعلك مِثلی حیاً لا تموت.... اے ابنِ آدم میری اطاعت کر تاکہ میں تجھ کو اپنی مثال پر ہمیشہ زندہ

رہنے والا (اور) کبھی نہ مرنے والا بناؤں گا۔ اِس پاک و پاکیزہ حدیث سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ شرطِ فنا برائے ابدی بقا اطاعت ہے، جو تین درجات پر مبنی ہے، خُدا کی اِطاعت، رسُولؐ کی اطاعت اور صاحبانِ امر کی اطاعت (۵۹/۴) اس حُکم کے مطابق فنا کے بھی تین درجے ہیں: فنا فی اللہ، فنا فی الرسُولؐ اور فنا فی الامامؑ، اِس ترتیب سے ظاہر ہے کہ نیچے سے اوپر جانے کے لئے سب سے پہلے امامؑ میں فنا ہو جاتا ہے۔

رُوحانی ارتقاء کے چار بڑے مراتب یا چار عالم مشہور ہیں، جو ناسُوت، ملکُوت، جبرُوت اور لاہُوت ہیں، اگر ہم بندۂ مومن کی عام ناسوتیت کی فنا کو بھی تسلیم کریں تو ہر عالم میں ایک فنا کا ہونا ضروری قرار پائے گا، اور امرِ واقعی بھی یہی ہے، پس مقامِ مومن ناسُوت ہے، منصبِ امامؑ ملکُوت، درجۂ پیغمبرؐ جبرُوت، اور مرتبۂ خُدا لاہوت ہے، جن میں سے ہر ایک عالم میں مومن فنا ہو جاتا ہے۔

اَب کیفیتِ فنا کا ذکر کرنا ضروری ہے:-

۱۔ خُدا اور رسُولؐ اور ولیٔ امرؑ (امام زمانؑ) کی اطاعت و فرمانبرداری میں آگے سے آگے بڑھ جانا، اپنے باطن میں اللہ، پیغمبرؐ اور امامِ وقتؑ کی حقیقی محبّت اور کامل عشق پیدا کرنا، اور دینِ حق کے لئے اپنے دل میں ایک مکمّل جذبۂ جانثاری رکھنا، ایسا ہے، جیسے مومنین بقولِ قرآن (۱۹/۵۷) جیتے جی راہِ خُدا میں شہید ہو چکنے کا درجہ رکھتے ہیں، یہ بحدِّ قوت "فنا فی الامام"

کا درجہ ہے۔

۲- آپ عالمِ شخصی یا عالمِ ذرّ کے بارے میں بہت سی عجیب و غریب باتیں جانتے ہوں گے، چنانچہ نورِ امامت میں بحکم: وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۳۶/۱۲) ہر عقل، ہر رُوح اور ہر ذروی جسم (ذرّۂ لطیف) موجود ہے، کیونکہ امام زمانؑ میں ہر چیز اُس وقت فنا ہو جاتی ہے (۲۸/۸۸) جبکہ آپؑ کی انفرادی قیامت قائم ہو جاتی ہے، مگر یہ تسلیم و فنا طوعاً و کرہاً ہے (۳/۸۳) یعنی یہ معاملہ خوشی کا بھی ہے اور زبردستی کا بھی۔

۳- حکمتِ قرآن کی روشنی میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "فنا" خاص ہے اور "ہلاک" عام، ہر چند کہ دونوں حالت میں چہرۂ خُدا کا ذکر آیا ہے، مگر دونوں کے درمیان بڑا فرق پایا جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ فنا جن و انس (مخلوقِ لطیف و کثیف) کے لئے مقرّر ہے، جس کے نتیجے میں ان کو ربّانی جلالت و کرامت کی صفات میں زندہ ہو جانے کی بےمثال نعمتیں حاصل ہو جاتی ہیں، اور ہلاک ہر چیز یعنی مخلوقِ عام کے لئے ہے، جس کا مقصد فیصلہ کرنا اور رجُوع ہو جانا ہے۔

۴- فرمایا گیا ہے: مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۳۱/۲۸) تم سب کا پیدا کرنا اور پھر (فنا کے بعد) جِلا اٹھانا ایک رُوح کی طرح ہے۔ یاد رہے کہ اس آیۂ مقدّسہ میں انتہائی بلندی کی حکمتیں پوشیدہ ہیں، کیونکہ اِس فرمانِ الٰہی میں لوگوں کی جسمانی تخلیق اور عام تصوّرِ قیامت کا ذکر نہیں، بلکہ یہاں ان کی اُس مجموعی رُوحانی تخلیق کا بیان

ہے، جو عالمِ ذرّ کے ذرّات میں ایک ساتھ مکمّل ہو جاتی ہے، جس کی وضاحت یُوں ہے کہ جب اِنسانِ کامل کی انفرادی قیامت میں جُملہ ارواح کی اِجتماعی قیامت برپا ہوتی ہے، تو اُس وقت تمام لوگ بشکلِ ذرّات عالمِ ذرّ میں حاضر ہو جاتے ہیں، اور یہ اُن کی رُوحانی خلق ہے، عالمِ ذرّ امامِ زمانؑ (انسانِ کامل) کا شخصی عالم ہے، نفسِ واحدؔ کا مطلب نفسِ کُلّی ہے، جو امامؑ کی عظیم رُوح ہے، نفسِ واحدہ کے معنی ایسی رُوح ہیں، جو فی ذاتہٖ ایک ہے اور دُوسری تمام جزوی رُوحوں کو اپنے وجُود میں ایک کر لیتی ہے، جبکہ واحدہ بروزنِ فاعلہ کے یہی معنی ہیں۔

اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ دونوں قسم کی مخلوق شعوری اور غیر شعوری طور پر صُورتِ رحمان یعنی چہرۂ خُدا میں فنا ہو کر اصل میں واصل ہو جاتی ہیں، مگر اُس درجۂ اعلیٰ میں خود کو بیدار پانے کے لئے کامل معرفت لازمی ہے۔

۵- جو مومنین امامِ زمانؑ کو اپنی سب سے عظیم رُوح مانتے ہیں، تو عالمِ ذرّان کے نام پر ہو جاتا ہے، جس میں سب کچھ ہے، کیونکہ امام کی عقل ہی عقلِ کلّی ہے، اِس کی رُوح ہی نفسِ کُلّی ہے اور اُس کا جُثّۂ ابداعیّہ جسمِ کلّی ہے، لہٰذا کائنات و موجُودات کی جُملہ اشیاء امامِ برحقؑ کی ذاتِ اقدس میں فنا اور محدُود ہیں، پس لوگوں کی خلق و بعث امامؑ میں ہے۔

سوال : ویسے تو ہر پیغمبرؑ اور ہر امامؑ بحکمِ خُداوند تعالیٰ اپنے وقت میں سلیمانؑ کی طرح رُوحانی سلطنت کا بادشاہ ہُوا کرتا ہے، کیونکہ ان سب حضرات کی رُوحانیّت ایک جیسی ہے، پھر اس کا سبب کیا ہے کہ صرف سلیمانؑ ابنِ داؤدؑ کی باطنی اور رُوحانی بادشاہی کا ذکر نمایان طور پر فرمایا گیا ہے ؟

جواب : جی ہاں، ان سب حضرات کی ضروری رُوحانیّت ایک اور مُشترک ہے، اور ہر ایک اپنے زمانے کا نفسِ واحدہ ہُوا کرتا ہے، مگر اس کی مثالیں زمان و مکان کی حکمت و مصلحت کے مطابق پیش کی گئی ہیں، اور اس میں لوگوں کو آزمانا بھی مقصُود ہے، لہٰذا اس قانُون کے مطابق رُوحانی سلطنت کی مثال پیش کرنے کا فریضہ حضرت سلیمانؑ کو سونپا گیا، اور نتیجے کے طور پر جنّ و انس وغیرہ آپ میں عقلاً و رُوحاً فنا ہو گئے۔

فقط، علمی خادم :-

نصیر الدّین نصیؔر ہونزائی

لندن : ۳۰/جولائی ۱۹۸۳ء

بُنیادی اور آخری حقائق

۱۔ اگر کہا جائے کہ سب سے پہلے عرش تھا، تو یہ بات بالکل صحیح ہوگی، کیونکہ قرآنِ حکیم میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا ذکر فرمایا گیا ہے، مگر تخلیقِ عرش کا کوئی تذکرہ نہیں، اِس لئے کہ عرشِ عظیم دائرۂ عالمِ خلق سے باہر اور بالاتر ہے، اور اس لئے کہ وہ عالمِ امر ہے، جس میں ابداع ہے، مگر تخلیق نہیں۔

۲۔ اگر مان لیا جائے کہ عرشِ رحمان کا ظہورِ خاص انسانی صُورت میں ہے جو اصل میں رحمان ہی کی صُورت ہے، تو اِس سے عظیم اور پاک جُثّۂ ابداعیّہ مُراد ہوگا جو آئینۂ مُبدِع اور مُبدَع ہے، اور یہی نہ صرف مرتبۂ اوّل و آخر ہے، بلکہ ظاہر و باطن بھی ہے۔

۳۔ اگر ہم اِس حقیقت کو تسلیم کریں، کہ بحدِّ قُوّت ہر انسان کی ایک ذاتی اور انفرادی کائنات بھی ہے، تو اُس صُورت میں یقیناً قرآنِ حکیم کا وہ تذکرہ جو تنزیلی معنیٰ میں اِس ظاہری اور مادّی کائنات کے بارے میں ہے، وہ آدم اور آدمی کے شخصی عالم سے متعلق قرار پائے گا، اور

آفرینش کا درست تصوّر یہی ہے۔

۴۔ آفاق اور انفس کے آپس میں حقیقی رشتہ یہ ہے کہ ظاہری کائنات کو رُوحانی شکل دے کر انسان کے باطن میں سما دی گئی ہے، اور انسان کی عظمت و بزرگی کی حقیقت بصورتِ کتاب کائنات ظاہر میں پھیلائی ہوئی ہے، پس یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ جس طرح عالمِ صغیر (انسان کی ذاتی دُنیا) اِنسانی صُورت میں محدُود ہے، اِسی طرح عالمِ کبیر رحمانی صُورت میں محدُود ہے، جو عرش عظیم اور پیکرِ نُور ہے۔

۵۔ سورۂ رحمان کے ایک پُرحکمت ارشاد کا یہ مفہوم ہے کہ سیارۂ زمین پر بسنے والے تمام اِنسان جو طرح طرح کی اموات سے فنا ہو جانے والے ہیں، وہ چہرۂ خُدا یعنی پیکرِ نُور (جُثّۂ ابداع) میں واصل ہو جائیں گے، اور اُن پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ سب سے بڑا احسان اِس بات کا روشن ثبوت ہے کہ وہ جلالت و کرامت اور نعمت کا مالک ہے (۵۵: ۲۶-۲۸)

۶۔ قرآن اپنی خاص تاویلی زبان میں بتا دیتا ہے کہ ذاتی اور انفرادی رُوحانیّت کی کائنات ہمیشہ چھ دن میں مکمّل ہو جاتی ہے، یعنی دو دن میں رُوحانیّت کی زمین، دو + دو = چار دن میں رُوحانیت کے پہاڑ، اور دو دن میں آسمان بن جاتے ہیں، ابتدائی دو دن سے حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کی رُوحانیت مُراد ہے، چار دن کے معنی ہیں حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت مُوسیٰؑ،

جن کی رُوحانیت کے دوران رُوحانی پہاڑ پیدا کئے جاتے ہیں اور دو دن حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ ہیں، جن کی رُوحانیت کی مُدّت میں ذاتی دُنیا کے آسمان بنائے جاتے ہیں (۹-۱۲/۱۴۱)

۷- خُداوند تعالیٰ نے نہ صرف انسان کی ذاتی دُنیا ہی کو چھ دن میں مکمّل کر دیا بلکہ اُس نے عالمِ دین کو بھی چھ بڑے دنوں (ادوار) میں بنایا، یعنی آدم، نوح، ابراہیم، مُوسیٰ، عیسیٰ اور حضرت مُحمّد صلوات اللہ علیہم کے چھ ادوار میں عالمِ دین کُلّی طور پر مکمّل ہوگیا۔

۸- اگر قرآنی حکمت میں بنظرِ غائر دیکھا جائے، تو اُس حقیقت سے آگہی ہوگی کہ وجُودِ عرش کا ذکر زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے بھی آتا ہے اور بعد میں بھی، اِس کی وجہ یہ ہے کہ شخصی رُوحانیّت اور عالمِ دین کا سفر ایک دائرے پر واقع ہے، جس کے نقطۂ آغاز کا تعلق عرش سے ہے اور منزلِ مقصود بھی عرش ہی سے متعلق ہے، چُنانچہ رُوحانی سفر کے درجۂ آخر میں پیکرِ نُور کی رُویت کا تجربہ ہوتا ہے کہ وہ مُبدِع بھی ہے اور مُبدَع (عرش) بھی۔

۹- قانُونِ "کُنْ" کے مطابق بلا تاخیر جسمِ لطیف اور رُوح کو کوئی شکل دینے کا نام ابداع ہے، اور یہ فعل مُبدِع یعنی پیکرِ نُور کا ہے، مگر اس کا تصوّر ہرگز ایسا نہیں کہ یہ صرف ایک بار واقع ہو چکا ہو، بلکہ یہ ہمیشہ کے لئے ہے، اگر ابداع کا فعل صرف ایک بار ہو گزرا ہوتا، تو اُس صُورت میں خُدا تعالیٰ کی قدُرت میں زبردست تنگی و کمی واقع ہو چکی ہوتی؛ لیکن یہ بات غیر ممکن ہے۔

۱۰۔ قصۂ مریمؑ میں بطریقِ احسن غور کیا جائے : مریم نے لوگوں سے در پردہ (بطریقِ تقیہ) خصوصی عبادت کا راستہ اختیار کر لیا، تو خدا تعالیٰ نے اس کی طرف اپنی رُوح القدس یعنی جبرائیل کو بھیجا، جو فعل ابداع سے ایک کامل و مکمل انسان کی صُورت (یعنی جُثّۂ ابداعیہ) میں مریمؑ کے سامنے ظاہر ہُوا (مفہوم : ۱۹/۱۷) پس اگر ابداع کا تعلق صرف ایک بار کے لئے ازل سے ہوتا یا یہ صرف عالمِ امر میں محدُود ہوتا تو بی بی مریمؑ پر ابداع کا یہ معجزہ نہیں گزرتا۔

۱۱۔ حضرت سلیمانؑ نے اپنے حدُودِ دین کے سرداروں سے کہا کہ تُم میں سے کون ایسا ہے جو ملکۂ سبا کے فرمانبردار ہو کر یہاں آنے سے قبل ہی انتہائی جلدی سے اس کے تخت (یعنی جُثّۂ ابداعیہ) کو میرے پاس لا سکتا ہے؟ تو جنات میں سے ایک عِفریت (یعنی لطیف حدُود میں سے ایک طاقتور شخص) نے کہا کہ میں اسے آپ کے اپنی جگہ سے کھڑے ہو جانے سے پہلے ہی لا حاضر کر دوں گا (اور اُس نے ایسا ہی کر دکھایا) اس کے اُوپر کے درجہ میں ایک اور ابداع تھا جس کے متعلق حدُودِ لطیف کے اس شخص نے کہا، جس کے پاس کتابِ رُوحانیّت کا ایک خاص علم تھا کہ مَیں اس کے تخت (جُثّۂ ابداعیہ) کو چشم زدن میں حاضر کر دوں گا، چنانچہ اُس نے ایسا کر دیا، جب حضرت سلیمانؑ نے مُبدِع کا یہ کمال دیکھا کہ ایک مُبدَعِ مُستقر اس کے سامنے تھا، تو کہا کہ یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے (مفہوم ۲۷/۳۸-۴۰) اس سے ظاہر ہے کہ رُوحانیت کا آخری درجہ ابداع ہے۔

۱۲- پیکرِ نورانی ایک ایسا مقام ہے کہ وہاں تمام اعلیٰ حقیقتیں ازلی وابدی طور پر جمع ہیں، چنانچہ یہی نفسِ کُلّی اور نفسِ واحدہ ہے، جہاں پر انسان ایک مستقل وجود رکھتا ہے، جس کے بارے میں حدیثِ قدسی کا ارشاد ہے کہ : یَا بنی آدمَ اَطِعْنی اجعلكَ مِثلی حَیًّا لا تموت .... الخ - اے ابنِ آدم میری اطاعت کر تاکہ میں تجھ کو میری اپنی ذات کی طرح لازوال اور غیر فانی بنا دوں گا۔ ربِّ کریم کے اس احسانِ عظیم کے یہ معنی ہیں کہ انسان کی اساسی اور آخری حقیقت ہمیشہ پیکرِ نور میں موجود ہے، بدین سبب حضرت مولانا امام سلطان محمّد شاہ صلوات اللہ نے مونوریالزم (حقیقتِ واحد) کا تصوّر پیش کیا ہے۔

۱۳- خدائے پاک کا پُرحکمت ارشاد ہے : وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ (۵۴/۵۰) اور ہمارا امر (یعنی کلمۂ کُن حقیقت میں) آنکھ کے جھپکنے کی طرح ایک ہے۔ یعنی اگرچہ انفرادی رُوحانیت کے درجاتِ عالیہ پر ظہورِ حقائق و معارف کے لئے کلمۂ امر کا وقوع بار بار ہوتا رہتا ہے، لیکن وہ مثال زمان و مکان سے بالاتر مقامِ وحدت پر ہے، لہٰذا وہ ہر اعتبار سے ایک ہی ہے، اور گوہرِ عقل میں حقائق اشیاء کی وحدت کو ظاہر کرتا ہے۔

۱۴- اللہ تعالیٰ کا برحق فرمان ہے : وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُولًا (۳۳/۳۷) اور خدا کا امر (کلمۂ کُن) کیا کرایا ہُوا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ انسان کے مستقبل اور موت کے بعد جتنی چھوٹی بڑی چیزیں

امرِ کن سے ظہور پذیر ہو جانے والی ہیں، اُن میں سے کوئی شئے نئی نہیں، کیونکہ ہر چیز وہی ہے جو پہلے سامنے آئی تھی، نہ تو قیامت کوئی جدید واقعہ ہے اور نہ ہی بہشت کوئی نیا مقام، مگر ہاں، ہر چیز میں جدّت پیدا ہو جانے کے لئے یہی قانونِ فطرت بنا ہُوا ہے کہ وہ چیز زمان و مکان کے اُس دائرۂ وسیع پر جس کی ابتدا و انتہا نہیں گھُوم گھُوم کر سامنے آجاتی ہے۔

۱۵۔ آیۂ مذکورہ بالا کے بموجب خُدا کی بادشاہی میں جہاں ہو جا (کُنْ) کا مقدّس فرمان ازل سے محیط ہے، وہاں عدمِ محض (یعنی کسی چیز کی قطعی نیستی) کا تصوّر غیر ممکن ہے، مگر یہ دُرست ہے کہ ایک اعتبار سے عالمِ امر کی تشبیہہ نیستی سے دی گئی ہے، کیونکہ وہ ایک پوشیدہ جہان ہے، جس کی کسی شئے کا ظہور "کُنْ" سے ہو جاتا ہے، اس کے یہ معنی ہُوئے کہ کلمۂ کُنْ کا اصل مقصد پوشیدگی سے کسی چیز کا ظاہر ہو جاتا ہے، اور ایسے ظہور کا تعلق نہ صرف دیدۂ دل سے ہے، بلکہ چشمِ ظاہر سے بھی ہے۔

۱۶۔ قرآنِ حکیم کا اصُولِ حکمت بڑا عجیب و غریب اور بدرجۂ کامل جامع ہے، یہاں مثال کے طور پر غور کیا جائے: اور ہم نے انسان کو گیلی مٹّی کے جوہر سے "خلق" کیا (یعنی انسان پہلے پہل ذرّاتِ لطیف میں اپنا رُوحانی وجُود رکھتا ہے) پھر ہم نے اِس کو نطفہ بنا کر ایک جگہ (عورت کے رحم) میں رکھا، پھر ہم ہی نے نطفہ کو جما ہُوا خُون بنایا، پھر ہم ہی نے منجمد خُون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا، پھر

ہم ہی نے لوتھڑے کی ہڈیاں بنائیں پھر ہم ہی نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر ہم ہی نے اس کو خلقِ آخر کی صورت میں اِنشا کیا، تو (سبحان اللہ) خدا بڑا بابرکت ہے جو سب بنانے والوں سے بہترین ہے (۲۳/۱۲-۱۴)۔ اِس ربّانی تعلیم میں کئی توجّہ طلب نکات ہیں، چنانچہ: "ولقد خلقنا الانسان مِن سُللَۃٍ مِّن طین" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو تخلیق کے مرحلۂ اوّل پر جوہرِ خاکی کے صرف ایک ہی عُنصر سے پیدا کیا گیا ہے، جس طرح جِنّ کو جوہرِ آتشی کے عُنصرِ واحد سے بنایا گیا ہے، تخلیقِ اِنسانی کے اِس مقام کا ایک خاص نام عالمِ ذرّ ہے جس میں تمام انسان بصورتِ ذرّاتِ لطیف رہتے ہیں، آفرینشِ انسان کی منزلِ ہفتم پر خلقِ آخر کا ذکر آیا ہے اور اِس سے جُثّۂ ابداعی مُراد ہے، اور اسی کی طرف خُداوند کی صفتِ "احسن الخالقین" کا اشارہ ہے۔

۱۷- آسمان سات ہیں، زمین بھی سات ہیں (۶۵/۱۲) ایّامِ ہفتہ سات ہیں، صاحبانِ ادوارِ مہین (حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمد مصطفیٰؐ اور حضرت قائمؑ صلوات اللہ علیہم اجمعین) سات ہیں، اور صاحبانِ ادوارِ کہین بھی سات سات ہیں یعنی ہر چھوٹے دَور کے ائمۂ طاہرین علیہم السّلام، اِسی طرح جسمانی اور رُوحانی تعمیر و تکمیل کے مراحل بھی سات سات ہیں، اور وہ یہ ہیں:-

۱- سُلالہ / جوہرِ خاک
۲- نُطفہ

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

۳۔ عَلَقہ / منجمد خُون

۴۔ مُضْغہ / گوشت کا لوتھڑا

۵۔ عِظام / ہڈیاں

۶۔ لحم / گوشت

۷۔ خلقِ آخر / مکمّل تخلیق۔

۱۸۔ مذکورہ بیان میں جو جو چیزیں سات نمبر پہ واقع ہیں، ان کے آپس میں مناسبت پائی جاتی ہے، یعنی آسمانِ ہفتم، زمینِ ہفتم، سنیچر کا دن، حضرتِ قائم ع، ہر ساتواں امام ع، اور خلقِ آخر، جو جسمِ لطیف ہے، اُس مناسبت کے یہ معنی ہیں کہ آسمانِ ہفتم حضرت قائم ع ہے، زمینِ ہفتم آپ ع کا حجّت ہے، سنیچر کی تاویل بھی قائم ہے، ہر ساتواں امام ایک طرح سے قائم ہے اور وہ قائم کے ایک اہم کام کو انجام دیتا ہے، اور خلقِ آخر کے مقام پر حضرت قائم ع کی شناخت حاصل ہو جاتی ہے۔

۱۹۔ چونکہ تمام چیزیں اپنے اپنے دائرے پر واقع ہیں، اِس لئے حضرت قائم ع حضرت آدم سے اِس طرح مِلا ہُوا ہے جس طرح سنیچر اتوار سے جا مِلتا ہے، جیسے ہر ساتواں امام پہلے امام سے مِلتا ہے، اور جیسے خلق آخر یعنی جُثّہ ابداعی عالمِ ذرّ سے متعلق ہے۔

۲۰۔ اِس بات سے شاید آپ کو تعجّب ہوگا کہ قرآنِ حکیم میں اگرچہ بظاہر صرف ایک ہی آدم کا ذِکر ملتا ہے، لیکن بباطن اس میں لاتعداد آدموں کا تذکرہ موجود ہے، اس کی مثال اسمِ "انسان" ہے، جو قرآنِ پاک میں بصیغہ واحد مذکور ہے مگر یہ اپنے معنی میں تمام انسانوں

کی نمائندگی کر رہا ہے۔

۲۱- آسمان، زمین، سورج، چاند، ستارے، دن رات، پانی، ہوا، درخت، حیوان اور انسان سب اپنے اپنے دائرے پر گردش کر رہے ہیں، ہاں سورج کائنات کے وسط میں ساکن تو ہے، مگر وہ ایک طرف سے بڑی سُرعت کے ساتھ تحلیل شدہ مواد کی صورت میں خارج ہوتا رہتا ہے اور دُوسری طرف سے ایندھن کی شکل میں اپنی بھٹی میں داخل ہو جانے کا سلسلہ جاری رکھتا ہے، اسی طرح وہ بھی گردش میں ہے، درخت بیج سے ہے اور بیج درخت سے، حیوان اور انسان نطفہ سے ہیں اور نطفہ اُن سے، اسی نہج پر ہر چیز گردش کرتی رہتی ہے، پس اس قانونِ فطرت سے ظاہر ہے کہ خُدا کی پادشاہی میں ہر طرف لاابتدائی اور لاانتہائی ہے۔

نصیرالدّین نصیرؔ
لندن - مورخہ ۱۲ر جولائی ۱۹۸۳ء

عالمِ شخصی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط۔ خُداوندا! خداوندا! تیرے حضورِ اقدس اور تیری بارگاہِ عزّت سے تائید و دستگیری مطلوب ہے، پروردگارا! اپنی عنایتِ بے نہایت سے اِس بندۂ مسکین و خاکسار کو توفیق عطا فرما کہ یہ ناچیز ہمیشہ خود کو خاکِ پائے مومنان سمجھ رکھے، آمین یا ربّ العالمین!

عالمِ شخصی ایک انتہائی دلچسپ اور بیحد مُفید موضوع ہے، کیونکہ یہ فرمانِ مبارک "مَنْ عَرَفَ نفسہ فقد عرف ربّہ" کے تحت آتا ہے، مگر یہ معلوم نہیں کہ مجھ ایسے بے مایہ درویش کے الفاظ کیسے ہوں گے، تاہم رحمتِ خُداوندی پر اُمید رکھنا بھی ضروری ہے، بہرکیف "عالمِ شخصی" خُداوند تعالیٰ کے نیک بندوں کے لئے ایک اُمید افزا تصوّر ہے، اِس ذاتی دُنیا (PERSONAL WORLD) کے کئی دُوسرے نام بھی ہیں، جیسے عالمِ صغیر، عالمِ نفسی، ذاتی دُنیا، عالمِ رُوحانیت، عالمِ باطن وغیرہ، ہر عظیم حقیقت کے

بہت سے نام ہُوا کرتے ہیں، مگر اس کا کام ہمیشہ ایک جیسا رہتا ہے۔

تصوّرِ آفرینش کی حقیقت کیا ہے؟ خُدا نے عالمِ دین کو کس طرح پیدا کیا؟ پیغمبرؐ اور امامؑ کی حقیقی شناخت کا وسیلہ کیا ہے؟ انسان کی حدوُدِ رسائی کہاں کہاں تک ممکن ہیں؟ رُوحِ مومن اور رُوحِ قرآن کے آپس میں کیا رشتہ ہے؟ انسان کی ذاتی دُنیا کا ذکر قرآن میں کہاں یا کس طرح ہے؟ ان جیسے بہت سے سوالات کے جوابات عالمِ شخصی کے اس موضوع میں داخل و شامل ہیں۔

حضرت مولانا مُرتضیٰ علی صلوات اللہ علیہ کے پُرحکمت ارشاد "مَن عَرَفَ نفسہ فقد عَرَفَ ربّہ" میں دو باتیں بُنیادی اہمیّت کی حامل اور قابلِ توجّہ ہیں، ایک یہ فرمانا کہ خُدا کی معرفت خود انسان کی ذات میں پوشیدہ ہے، دُوسرا یہ حکم کہ معرفت کا لگاؤ اسمِ "ربّ" سے ہے، ربّ (یعنی پرورش کرنے والا) تو ساری کائنات و موجُودات کا ہے، مگر معرفت صرف یہ دیکھنے اور معلوم کر لینے سے حاصل ہو گی کہ اشارۂ "ربّہ" کے مطابق خُدا انسان کی عقلی، علمی اور رُوحانی پرورش کس طرح کرتا ہے، جس کے لئے عالمِ شخصی کے مقاماتِ رُوحانی اور درجاتِ عقلی کا مطالعہ و مشاہدہ کرنا ہوگا، کیونکہ وہاں ربّ العزّت کی جُملہ صفات کے علمی و عرفانی ظہورات ہوتے رہتے ہیں۔

جی ہاں، معرفت کا تعلق اسمِ ربّ سے ہے، اور ربّ کی

رُبوبیّت وہ صِفت ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی تعریف کرتے ہُوئے فرماتا ہے: اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِینَ، یعنی سب تعریف اللہ کی ہے جو کائنات، عالمِ دین اور عالمِ شخصی کا پروردگار ہے، اگر مولا علیؑ کے نزدیک عالمِ شخصی میں کائناتِ ظاہر اور عالمِ دین کی تمام مثالیں جمع نہ ہوتیں اور اس میں صفتِ رُبوبیّت کا ہرگونہ ظہور نہ ہوتا تو آپؑ انسانی رُوح کو درس گاہِ معرفت کا درجہ نہ دیتے، اِس سے یہ حقیقت ظاہر اور روشن ہو جاتی ہے کہ عوالِم یا دُنیائیں خواہ اٹھارہ ہزار یا لاتعداد کیوں نہ ہوں لیکن عقل، رُوح اور جسم کی گوناگون تربیت و پرورش کون کرتا ہے اور کس طرح، اِس کا ثبوت اور کامل معرفت عالمِ شخصی میں ہے۔

قرآنِ حکیم میں جہاں جہاں اور جتنی بار تخلیقِ کائنات کا ذکر آیا ہے، اِس میں بزبانِ حکمت ضروری طور پر شخصی دُنیا کا تذکرہ بھی موجود ہے، اور عالمِ دین کا تذکرہ بھی، کیونکہ یہ ظاہری کائنات اور اس کی حدوُد میں جو کچھ ہے وہ اِنسان کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اور یہ کیسے مناسب و ممکن ہو سکتا تھا کہ ظاہری اور مادّی دُنیا جو انسان کی خاطر ہے اس کی آفرینش کا ذکر فرمایا جائے، مگر باطنی اور رُوحانی عالم جو خود انسان ہے اس کا تذکرہ نہ کرے، ایسا نہیں ہے بلکہ اس ہدایت نامۂ سماوی میں جو بنی نوعِ اِنسان کی ظاہری و باطنی ترقی کی غرض سے نازل ہُوا ہے دُنیا و آخرت کے بارے میں جو کچھ ارشاد

ہُوا ہے اس کا براہِ راست تعلق عالمِ انسان سے ہے کیونکہ خود انسان باعتبارِ جسم دُنیا ہے اور باعتبارِ رُوح آخرت۔

قرآن پاک میں لفظ "عالمین"، جو عالم کی جمع ہے جس کا لفظی ترجمہ "دُنیائیں" ہے، اس سے بقول حضرت امام جعفرالصّادق علیہ السّلام عالمِ انسان مُراد ہے اور یہ بصُورتِ جمع اس لئے ہے کہ ہر انسان بحدِّ قوّت یا بحدِّ فعل ایک دُنیا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَمَا اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (۲۱/۱۰۷) اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت عوالمِ انسانیت کے لئے رحمتِ خُداوندی ہیں، مگر حصُولِ رحمت کی استطاعت میں سب انسان ایک جیسے نہیں ہو سکتے، لہٰذا صیغۂ جمع لایا گیا، یعنی عالمین (انسانیت کی دُنیائیں)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدۡ كَتَبۡنَا فِی الزَّبُوۡرِ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّكۡرِ اَنَّ الۡاَرۡضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوۡنَ (۲۱/۱۰۵)

تاویل: اور ہم نے تکمیلِ ذکر کے بعد کتابِ رُوحانیت میں لکھ دیا کہ رُوئے زمین کے وارث ہمارے صالح بندے ہوں گے۔ زبور کتاب کو کہتے ہیں، اور یہاں کتابِ رُوحانیت مُراد ہے جو رُوحانی ترقی کے بعد وجود میں آسکتی ہے، اور اس کتاب میں لکھنا یہ ہے کہ بطورِ عملی نمونہ ایسے بندوں کو انفرادی عالم کی زمین کے وارث بنادیا جاتا ہے تاکہ عظیم رُوحانی سلطنت کا یقین ہو سکے، اس سے ظاہر ہے کہ ذاتی دُنیا میں سب کچھ ہے اس میں آسمان و زمین اور ان کی ساری چیزیں موجود ہیں۔

قرآنِ کریم (۳۱/۲۰) میں ارشاد ہے : کیا تم لوگوں نے اِس پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (غرض سب کچھ) خدا ہی نے تم کو مُسخّر کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دیں اور لوگ ایسے بھی ہیں جو خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں (حالانکہ ان کے پاس) نہ علم ہے اور نہ ہدایت ہے اور نہ کوئی روشن کتاب ہے (۳۱/۲۰) اِس ربّانی تعلیم سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ جُملۃً کائنات انسان کے لئے مُسخّر کی گئی ہے، اور اِس تسخیر کی دو صُورتیں ہیں، ایک یہ کہ عالمِ ظاہر اور اس کی چیزیں مجمُوعاً انسان کے کام میں لگی ہُوئی ہیں، اور دُوسری صورت یہ ہے کہ کائنات اپنے اندر کی تمام اشیاء کے ساتھ بشکلِ لطیف اِنسان کے باطن میں سما گئی ہے اور اسی طرح تعجّب ہے کہ عالمِ کبیر عالمِ صغیر میں محدُود ہو گیا ہے، تاکہ خُدا کی ظاہری اور باطنی نعمتیں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں، یہ تسخیر عِلم، ہدایت اور کتابِ مُنیر سے ممکن ہے، روشن کتاب امامِ زمانؑ کا نور ہے، رُوحانی ہدایت حُجّت کا درجہ ہے اور علمِ یقین داعی کا مرتبہ ہے، پس اِس آیۂ مبارکہ کے بموجب اللہ تعالیٰ کی تمام ظاہری نعمتیں اِنسانوں کو عالمِ جسمانی کے مُسخّر ہونے سے حاصل ہیں، اور باطنی نعمتیں اس کی صورتِ باطن سے ملی ہیں جو انسان کے باطن میں ہے، اور یہ سب کچھ کتابِ مُنیر کی بدولت ہے جو مومنین میں امام کی رُوحانیت و نُورانیت اور علمی تاویل ہے، جس میں کائنات کی ایک مکمّل علمی صُورت موجُود ہے۔

عِلْمٌ (جاننا) ع ل م کے مادّہ سے مصدر ہے، عَالِمٌ اسمِ فاعل ہے اور "عَالَمٌ" اسمِ آلہ ہے، یعنی وہ چیز جس کے ذریعہ چیزیں جانی پہچانی جاتی ہیں، چنانچہ خُدا نے عالمِ کبیر کو عالمِ صغیر میں سما دیا، یعنی اُس نے اپنی رحمت سے عِلم کے آلۂ ظاہر کو آلۂ باطن کے ساتھ ایک کر دیا، اور اسی طرح نہ صرف "عَالَمِیْنَ" کے معنی کا اطلاق براہِ راست اِنسانوں پر ہُوا، بلکہ اِس سے یہ حقیقت بھی روشن ہو گئی کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا نُور اِس معنیٰ میں ہے کہ وہ ساری کائنات کی رُوحانی صُورت کو چشمِ حقیقت بین کے سامنے رکھ دیتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ بہشت کا طول و عرض اِس مادّی کائنات کے برابر ہے (۳/۱۳۳، ۵۷/۲۱) اور اہلِ دانش اِس حقیقت پر یقین کر سکتے ہیں کہ جو چیز اِس ظاہری کائنات کے بالکل برابر ہے، وہ اس کا جُثّۂ ابداعیہ ہے، جو جنّت بھی ہے اور کائنات کا لطیف جسم بھی ہے، اور آسمان و زمین کے ابداعی صُورت میں موجُود ہونے کا ثبُوت اِس فرمانِ الٰہی میں ہے: بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (۲/۱۱۷) وہی آسمانوں اور زمین کا بدیع اور مبدِع ہے اور جب کوئی امر پُورا ہوتا ہے تو اسے کُن فرماتا ہے اور وہ ہو جاتا ہے، پس معلوم ہُوا کہ کائنات کے لطیف و کثیف دو جسم ہیں، جس طرح قرآن اِس حقیقت کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے اور اِس بات پر زور دیتا

ہے کہ کوئی چیز جفت یعنی جوڑے کے بغیر نہیں، سو کائنات کے ہوں یا انسان کے جسمِ لطیف و کثیف بطریقِ ضدّ جفت ہیں۔

اِس بیان کے بعد کہنا یوں ہے کہ کائنات جہاں جسمِ لطیف کے اعتبار سے ابداعی شکل میں موجود ہے، وہاں اس میں ہمیشہ کُن فیکون کے گوناگون ظہورات ہوتے رہتے ہیں، لہٰذا اس کا سب سے عظیم ظہور انسانِ کامل کی صورت میں ہوتا ہے، جو خدا کی خدائی کے عظیم بھیدوں کا خزانہ ہے، اور یہ وہ مقام ہے جس میں جُملۂ کائنات بوجہِ ابداعِ ظاہر موجود ہوتی ہے، جس طرح پیشانی میں ہمہ جہان بوجہِ ابداعِ باطن موجود ہوتا ہے، اِس کا مطلب یہ ہے کہ ابداع ظاہر میں بھی ہے اور باطن میں بھی۔

مذکورہ حقیقت دُوسرے لفظوں میں پیش کی جاتی ہے کہ جس طرح عالمِ صغیر ایک ایسے اِنسان میں محدود ہے کہ وہ ابھی انسانِ کامل نہیں ہوا ہے، اسی اصول کے مطابق عالمِ کبیر کا جسمِ لطیف ایک ایسے انسان کی ہستی میں سمایا ہوا ہے کہ وہ کامل اور مکمّل ہے، جیسا کہ فرمودۂ خدا ہے: وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۲۵۵/۲) اس کی کُرسی سب آسمانوں اور زمینوں کو گھیرے ہوئے ہے، یعنی اِنسانِ کامل کا جُثّۂ نُورانی جو نفسِ کُلّی سے رل گیا ہے، اللہ کی کرسی ہے، جس میں کائنات کی ابداعی صورت بطریقِ جسمِ لطیف سما گئی ہے۔

ایک حدیث کے مطابق انسان خدا کا راز ہے اور خدا انسان کا

رازہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے عوام سے یہ حقیقت پوشیدہ رکھی ہے کہ انسان اوّل و آخر میں کیا رُتبہ رکھتا ہے اور ربِّ کریم کا اُس سے کیا رشتہ ہے، یہ بات عوام النّاس کے اعتبار سے فرمائی گئی ہے، مگر انبیاءؑ و اولیا کے توسّط سے خُدا کے بعض بندے یہ جان چُکے ہیں کہ یہ راز کیا ہے، کیونکہ تفاوتِ عمل اور ترقی و پسماندگی کے سبب سے لوگوں کے مختلف درجات ہُوا کرتے ہیں۔

اِنسان رُوحانی اعتبار سے اِس دُنیا میں کیسے آیا؟ کیوں آیا؟ کہاں سے آیا؟ اگر مانا جائے کہ یہ اللہ کے حضور سے یہاں آیا ہے، تو بہت بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ خُدا کے قرب کو چھوڑ کر اس دُنیا میں کیُوں آنا چاہیئے؟ اِن جیسے بڑے بڑے سوالات اور بھی ہیں، مگر یہ جاننا ضروری ہے کہ رُوح کیا ہے، تاکہ بوقتِ ضرورت سوال صحیح ہو، اور بہت سے سوالات وہیں پر ختم ہو جائیں، چنانچہ اگر کہا جائے کہ رُوح بسیط ہے یعنی ایک ہمہ گیر اور ہمہ رس حقیقت، تو بہت سے سوال ختم ہو جاتے ہیں، اور اگر یہ قبُول کر لیا جائے کہ رُوح صُورتِ رحمان ہے، جیسے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی رحمانی صُورت پر پیدا کیا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آدم و بنی آدم رحمان کی زندہ تصویریں ہیں، اور حقیقتِ رُوح کے متعلق یہی تصوّر سب سے بہتر اور قابلِ فہم ہے۔

سُورج کی روشنی کائنات میں پھیلتی رہتی ہے مگر یہ ایک طرف

سے سرچشمۂ خورشید سے وابستہ رہتی ہے، اسی طرح رُوح اپنی اصل کے ساتھ اتّصال رکھتی ہے، جیسے درخت سے اس کا سایہ مربُوط رہتا ہے، جس طرح کسی دُور مُلک سے آپ کو فون آتا ہے، آپ اس مثال میں بھی سوچ سکتے ہیں کہ کس طرح ایک ہی بجلی گھر سے کسی شہر کے لاکھوں بلب روشن ہو جاتے ہیں، وائرلیس، ریڈیو، فلم اور ٹی وی میں رُوح کے عجائب و غرائب کی بہت سی مثالیں موجُود ہیں، مگر یہ معلوم نہیں کہ کوئی کس طرح سوچتا ہے۔

شخصی عالم ایک ایسا جہان ہے، جس میں تصوّرِ آفرینش کی روشن حقیقتیں موجود ہیں، اور اس میں خُدا نے یہ علم بھی رکھا ہُوا ہے کہ عالمِ دین کس طرح مکمّل ہُوا، پیغمبرؐ اور امامؑ کی معرفت نُور کی شناخت سے الگ نہیں، انسان کی رسائی معرفت تک ہے اور پھر کیا چاہئے، رُوحِ مومن اور رُوحِ قرآن ازل اور ابد میں ایک ہے، انسان کی ذاتی دُنیا کا ذکر قرآنِ پاک کی ہر آیت میں موجُود ہے، جبکہ عالمِ کبیر اور عالمِ دین دونوں عالمِ شخصی میں سماتے ہوتے ہیں۔

فقط آپ کا علمی خادم

نصیر الدین نصیر ہونزائی

لندن ۲۴ر جولائی سنہ ۱۹۸۳ء

قرآنِ حکیم میں لفظِ "نعمت"

"نعمت" قرآنِ پاک کے خاص اور پُر حکمت الفاظ میں سے ہے، کیونکہ یہ اپنے معنی میں بڑا جامع ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ لفظ اُمّ الکتاب (سورۂ فاتحہ) میں بمقامِ "انعمتَ علیہم"، استعمال فرمایا گیا ہے، جس کے بموجب "صراطِ مُستقیم"، اِس لئے قابلِ تعریف ہے کہ وہ ان حضرات کا راستہ ہے، جن کو خُداوندِ عالم نے اپنی تمام نعمتوں سے نوازا ہے (۴/۶۹)۔

نعمت کے معنی ہیں عنایت، اِحسان، خوش حالی اور ہر وہ چیز جس میں لذّت و راحت ہو، اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے تین قسم کی نعمتیں بنائی ہیں، اُن میں سب سے اعلیٰ درجہ کی نعمتیں عقلی اور علمی صورت میں ہُوا کرتی ہیں، دُوسری قسم کی نعمتیں رُوحانی شکل میں پائی جاتی ہیں اور تیسری قسم کی نعمتیں وہ ہیں، جن کا تعلّق جسم سے ہے، یعنی مادی اور جسمانی نعمتیں، جو اِس دُنیائے ظاہر میں نظر آتی ہیں۔

نعمتوں کی ایک اور تقسیم بھی ہے، جس کے مطابق وہ ظاہری نعمتیں اور باطنی نعمتیں کہلاتی ہیں، جیسے قرآنِ مقدّس کا ارشاد ہے: وَاَسبَغَ علیکُم نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّ بَاطِنَۃً (۳۱/۲۰) اور (خدا نے) تم پر اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں پوری کر دیں۔ اِس سے یہ مطلب صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح جسم ظاہر ہے اسی طرح جسمانی نعمتیں بھی ظاہر ہیں، اور جس طرح عقل و رُوح پوشیدہ ہیں، اِسی طرح عقلی اور رُوحانی نعمتیں بھی باطن ہیں، اور اس کی منطق یہ بنتی ہے کہ قرآن اور اسلام کی تمام تر عقلی اور رُوحانی نعمتیں تاویلی حکمت میں پنہاں ہیں، جس کی مثال آپ دُنیائے ظاہر ہی میں دیکھ سکتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو جسم کی غذا اور نعمتِ جسمانی کہلاتی ہے، وہ پوشیدگی سے نکلتی ہے یا نکالی جاتی ہے، چنانچہ درخت یعنی پودا زمین سے سر اُبھارتا ہے، پھل درخت کے باطن سے پیدا ہوتا ہے، پھل کا وہ حِصّہ جو کھایا جاتا ہے، چھلکے سے برآمد ہو جاتا ہے، گٹھلی اُس کے باطن میں ہوتی ہے مغز گٹھلی میں سے نکالا جاتا ہے اور تیل مغز کے باطن سے نکالا جاتا ہے، جو اس سلسلے میں سب سے باطنی چیز ہے، اِسی طرح دُودھ گائے کے باطن سے پیدا ہوتا ہے، مکھّن دُودھ کے باطن سے، تیل مکھن کے باطن سے اور اِنرجی (ENERGY) تیل کے باطن سے، اِن مثالوں سے معلوم ہُوا کہ اگرچہ جسمانی نعمتیں ظاہر ہیں، تاہم وہ اہلِ دانش کے سامنے بڑی عُمدگی سے یہ مثال پیش کرتی ہیں کہ عقل اور

رُوح کی نعمتیں کس طرح باطن ہیں۔

آیۂ کریمۂ قرآن (۵/۳) کے مطابق اسلام کی تکمیل اور نعمتِ خداوندی کا اتمام اُس روز ہُوا تھا جبکہ مولا مُرتضیٰ علیؑ آنحضرتؐ کے جانشین مقرّر ہُوئے تھے، اس سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ سلسلۂ نزولِ قرآن کا مکمّل ہو جانا اور ولیّ امر کے تقرّر کا عمل میں آنا اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، جس سے بڑھ کر اس دُنیا میں کوئی نعمت نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا شدہ نعمتوں کو یاد کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے، یہ عمل اگر ایک طرف سے شکرگزاری اور قدردانی ہے تو دُوسری طرف سے اس میں یادِ الٰہی اور مسرّت و شادمانی کا ایک عظیم فلسفہ بھی ہے، یقیناً ربِ کریم کے احسانات کا تذکرہ اپنے دامنِ مقدّس میں خوشیوں کے پھُول لا دیتا ہے۔

خُداوند تعالیٰ بنی اسرائیل سے فرماتا ہے کہ: اے بنی اسرائیل (یعقوبؑ کی اولاد) میری عطا کردہ نعمت کو یاد کرو (۲/۴۰)۔ اس میں پروردگارِ عالم کے ان تمام احسانات کے معانی لفظِ "نعمت" میں سمو گئے ہیں، جو طرح طرح کے معجزات اور علم و حکمت کی صُورت میں تھے، اس کا مطلب یہ ہُوا کہ نعمت خُدا کے ہر اُس احسان کا نام ہے، کہ اس کے بغیر دین میں اللہ کی رحمت کا کوئی ثبُوت نہیں مل سکتا ہے۔

دُنیا میں کہیں ماں باپ کے بغیر بھائیوں کا تصوّر نہیں، چنانچہ پیغمبر خُداؐ اور آپؐ کے وصی مولا علیؑ مومنین کے حق میں نہ صرف خُدا

کی رسّی تھے بلکہ روحانی ماں باپ بھی تھے، پس یہی سبب ہے کہ قرآن میں جہاں اللہ کی رسّی کا ذکر ہے، وہاں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ تم اُس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے" (۳/۱۰۳) یہاں نعمت سے رُوحانی ماں کا دُودھ مُراد ہے، یعنی تعلیم و ہدایت، جس کی بدولت مومنین رشتۂ اخوت سے وابستہ ہو گئے۔

قرآنِ حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے: بیشک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے تختوں پر بیٹھے نظارے کریں گے (۸۳/۲۲) یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ بہشت کا تخت کیسا ہے، اور جنّت والوں کے نظارے کی کیا حدود ہوں گی؟ جواب عرض ہے کہ وہ تخت بے جان نہیں بلکہ زندہ ہے، جس کی مثال یو۔ ایف۔ او یا جسمِ لطیف ہے، جس کے ذریعہ وہ پوری کائنات کی سیاحت اور نظارہ کریں گے۔

سورۂ نمل کی آیت ۱۵ تا ۱۹ کا مطالعہ کر کے ہر دانشمند مومن یہ یقین کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کو جو علم و فضل اور جو رُوحانی سلطنت عطا فرمائی تھی، وہ خداوندِ مہربان کی عظیم ترین نعمت تھی۔

بہشت کی اُن تمام چیزوں کا نام نعمت ہے، جن میں عقل اور نفسِ مطمئنّہ کے لئے گوناگون اعلیٰ لذّتیں اور راحتیں رکھی ہوئی ہیں، جیسے ارشاد ہے: وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا

وَمُلْكًا كَبِيرًا" (۷۶/۲۰) اور جب تم وہاں نگاہ اُٹھاؤ گے تو ہر طرح کی نعمت اور عظیم الشان سلطنت دیکھو گے۔ یہ سلطنت جو سب سے عظیم اور لازوال ہے کس کی ہوگی؟ خُداوند کی اور اُس کے برگزیدہ بندوں کی۔

خُدائے بزرگ و برتر نے جس جس درجہ کے کامل اور برگزیدہ انسانوں کو اپنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں، وہ نبیّین، صدّیقین، شُہدا اور صالحین کے علاوہ فرمانبردار مومنین ہیں، اور اگر موضوعِ نعمت کے اس ربط کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ مضمون تمام قرآن میں پھیلا ہُوا دکھائی دیتا ہے، اِسی طرح لفظِ نعمت قرآنِ حکیم کے دُوسرے بہت سے جامع الفاظ کے ساتھ ملا ہُوا نظر آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پیاری کتاب (قرآنِ عزیز) عقلی، علمی اور رُوحانی نعمتوں کے تذکروں سے بھرپُور ہے، اور خاص کر سورۂ رحمان جو مولا علی صلوات اللہ علیہ کے مبارک ارشاد کے مطابق عروس القرآن ہے، اس میں عالمِ دین کی اُن جُملہ نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، جو مخلوقِ لطیف و کثیف کے لئے بنائی گئی ہیں، جہاں نعمتوں کا تذکرہ "الاء" کے نام سے فرمایا گیا ہے۔

سورۂ رحمان میں سب سے پہلے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ خُداوند مہربان نے جو کچھ سکھایا ہے، اور جو کچھ بنایا ہے وہ نعمت ہی نعمت ہے، اور اللہ کی ان تمام نعمتوں میں جن و اِنس دونوں

برابر کے شریک ہیں ، اور اِس سے لازمی طور پر یہ سوال اُٹھتا ہے کہ جنّ و اِنس کے درمیان وہ رشتہ کیا ہے جس کی وجہ سے یہاں یہ دونوں ہر عظیم نعمت پر ایک دُوسرے کے ساتھ ہیں ؟ اس کے جواب کے لئے یُوں عرض کیا جاتا ہے کہ جنّ درحقیقت انسان کا ایک لطیف رُوپ ہے اور اِنسان اُس کا ایک کثیف رُوپ ، چُنانچہ یہ اُس کے بغیر اور وہ اِس کے سوا مکمّل نہیں ، اور اگر یہاں یہ سوال بھی ہو کہ جب جنّ جوہرِ آتش سے اور انسان جوہرِ خاک سے پیدا کیا گیا ہے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں مخلوق ایک ہوں ؟ اس کے لئے جواب عرض کرتا ہُوں کہ وہ بات عالمِ ذرّ سے متعلق ہے ، کہ وہاں عناصر کے الگ الگ اجزاء اور ذرّات تک زندہ ہیں ، مگر اُس میں کوئی مخلوق اس دُنیا میں آئے بغیر مکمّل نہیں ہو سکتی ہے ، چُنانچہ اِنسانی جسم اگرچہ بظاہر صرف اِنسان ہی کے لئے مخصوص لگتا ہے ، تاہم حقیقت اِس کے برعکس ہے کیونکہ اِنسانی صُورت میں سب کچھ جمع ہے ، جبکہ یہ ایک کائنات ہے ، تو اس میں جمادات و نباتات تو ترقی اور فنا کی شکل میں ہیں ، لیکن اخلاقی اور مذہبی طور پر گرا ہُوا آدمی بموجب قانُونِ خُداوندی حیوان ہے (۷/۱۷۹ ، ۲۵/۴۴) اگر کوئی آدمی لوگوں کو گمراہ کر دینے والا ہے تو وہ شیطان ہے (۲/۱۴) اور اگر کوئی خُدا کا برگزیدہ ہے تو وہ فرشتہ ہے (۶/۹ ، ۱۷/۹۵) ۔

سورۂ رحمان میں جنّ و اِنس سے یہ سوال : فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا

تُکَذِّبٰنِ (اے گروہِ جنّ و انس تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاتے ہو؟) کُلّ ۳۱ مرتبہ کیا گیا ہے، اور ۳۱ حدودِ دین کا عدد ہے، یعنی پانچ حدودِ رُوحانی، سات صاحبانِ ادوارِ مِہین، سات صاحبانِ ادوارِ کہین، اور بارہ حُجّت (۵ + ۷ + ۷ + ۱۲ = ۳۱)
پس یہ تمام نعمتیں جن کا پُرحکمت ذکر اِس سورہ میں فرمایا گیا ہے عقلی، علمی، عرفانی اور رُوحانی ہیں، جو حدودِ دین سے متعلق ہیں، یعنی عقلِ کُلّ، نفسِ کُلّ، جدّ، فتح، خیال، چھ ناطق، حضرت قائمؑ، سات أئمّہؑ (ہر چھوٹے دور کے) اور بارہ حُجّت۔

اِنسان خواہ جسمِ خاکی کی نسبت سے بشر کہلائے یا جسمِ لطیف کے سبب سے جنّ، ہر حالت میں حدودِ دین کی اُن نعمتوں کا محتاج ہے، جن کا ذکر عروس القرآن (سورۂ رحمان) میں فرمایا گیا ہے، پس ہر مومن پر فرض ہے کہ وہ نورِ علم کی روشنی میں خود کو پہچان لے اور ان نعمتوں کو بھی پہچان لے، جو قرآن خاص کر سُورۂ رحمٰن میں مذکور ہیں۔

کسی دیندار کو جنّ کے متعلق بڑے سے بڑے شک میں مُبتلا رہنا زبردست عرفانی نقصان کا باعث ہے، لہٰذا اِسے یہ جاننا ضروری ہے کہ جس طرح سب اِنسان ایک جیسے نہیں ہو سکتے، کیونکہ کچھ تو اچھے ہیں اور کچھ بُرے، بالکل یہی بات جنّات میں بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایتِ بے نہایت سے قرآنِ حکیم میں ہر ضروری بات بتا رکھی ہے،

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

چُنانچہ سُورۂ جنّ میں فرمانِ خُداوندی ہے :-

وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا (۷۲/۱۱) اور یہ کہ ہم میں سے کچھ لوگ نیکوکار ہیں اور کچھ لوگ اور طرح کے ہیں، ہم لوگوں کے بھی کئی طرح کے فرقے ہیں۔ پس لفظِ جنّ فی ذاتہٖ (یعنی لُغوی لحاظ سے) کوئی بُرا لفظ نہیں، جس طرح شیطان کا لفظ بُرا اور فرشتہ کا نام اچھّا ہے، مگر جنّ و اِنس لفظی معنی میں اس کے برعکس ہیں، کہ اس معنیٰ میں اعمالِ نیک و بد کا کوئی ذکر موجود نہیں، جیسے خُداوندِ عالم کا پاک ارشاد ہے :-

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ (۵۱/۵۶)

اور میں نے جنّ و اِنس کو اِس غرض سے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔ ظاہر ہے کہ جنّ و اِنس کے دونوں لفظ ایک جیسے ہیں کہ اُن میں ابھی اچھے یا بُرے اعمال کا کوئی فیصلہ نہیں ہے، لیکن عوام النّاس کے قِصّہ کہانی کی طاقت کو دیکھو تو یہی کہ اس سے جِن کُلّی طور پر بدنام ہو چکا ہے، حالانکہ سورۂ جن کی مذکورۂ بالا آیت کے مطابق نیکوکار یعنی مومنینِ جنّات کے لئے "صالحون" کا لفظ استعمال ہُوا ہے، اور اس لفظ کی معنوی بلندی اِس قدر پُر حکمت اور قابلِ تعریف ہے کہ یہ انبیائے کرامؑ کے لئے استعمال ہوا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :......کُلٌّ من الصّالحین (۶/۸۵)....

یہ تمام پیغمبر صالحین میں سے ہیں۔

اِس دُنیا میں کچھ کیڑے ایسے بھی ہیں، جو آگے چل کر پروانے پتنگے بن جاتے ہیں، پروانے تو لا تعداد ہُوا کرتے ہیں، مگر سب کی کوئی اہمیّت نہیں، اہمیّت اور قدر و قیمت صرف ان پروانوں کی ہوتی ہے جو ریشم کے کیڑوں سے بن جاتے ہیں، قرآنِ حکیم میں دیکھئے: یوم یکونُ النّاسُ کالفَراشِ المبثوثِ (۱۰۱/۴) جس دن لوگ پروانوں کی طرح پھیلے ہوں گے۔ یعنی سب لوگ ذرّاتِ لطیف میں ہوں گے، اِس آیت میں اِنسانوں کے کثیف سے لطیف بن جانے کا ذکر ہے، جو پروانے ریشم کے کیڑوں سے ہیں ان کو بچا لیا جائے گا، یہ صالحین کی مثال ہے۔

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

لندن: ۱۶ر جولائی سنہ ۱۹۸۳ء

قرآنِ حکیم میں لفظِ "امین"

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم - لفظِ "امین" قرآنِ حکیم کے اُن پیارے پیارے الفاظ میں سے ہے، جو مغزِ معنی و حکمت سے بھرپور ہیں، امین کا مادّہ ام ن ہے، اور یہی مادہ ایمان کا بھی ہے، امین کے معنی امانتدار، معتبر اور امن والا ہیں۔

کُلّ ۱۴ (چودہ) بار

امین کا لفظ قرآنِ پاک میں کُلّ ۱۴ بار استعمال فرمایا گیا ہے، یہ لفظ اپنے معنی میں ہر بار ایک پاکیزہ وجُود کو پیش کرتا ہے جیسے جبرائیلؑ، رُسُل، شہرِ مکّہ وغیرہ، الف میم نون کے اور بھی مشتقّات قرآن میں موجُود ہیں، سو یہاں (اِن شاء اللہ تعالیٰ) سعی کی جاتی ہے کہ ان آیاتِ کریمہ کی پوشیدہ حکمتوں کی طرف توجّہ دلائی جائے جو لفظ امین سے متعلق ہیں۔

بارِ امانت

ترجمۂ آیۂ کریمہ ہے کہ : یقیناً ہم نے امانت کو سارے آسمان اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو اُنہوں نے اس (بار) کے اُٹھانے سے انکار کیا اور اِس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اُٹھالیا، بیشک اِنسان (اپنے حق میں) بڑا ظالم (اور) نادان ہے (۳۳/۷۲) اب سوال اُٹھتا ہے کہ یہ امانت کیا تھی؟ آیا یہ اختیار تھا؟ کیا یہ عبادت و معرفت تھی؟ وہ کون سا بارِ گران تھا جس کے اُٹھانے سے کائنات نے انکار کیا اور ڈر گئی؟ اور پھر جب اِنسان نے اسے اُٹھالیا تو وہ ظلوم و جہول کس سبب سے کہلایا؟ اِن شاء اللہ یہ سوالات اِس مضمون میں حل ہو سکتے ہیں۔

حضرت نوح ؑ امین تھے

آیۂ مقدّسہ کا ترجمہ ہے کہ : نوح ؑ کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا، جب اِن سے ان کے بھائی نوح ؑ نے کہا کہ تم لوگ (خدا سے) کیوں نہیں ڈرتے، مَیں یقیناً تمہارا امانتدار پیغمبر ہُوں، تم خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (۲۶/۱۰۵-۱۰۸) اِس ربّانی تعلیم کے مطابق حضرت نوح علیہ السّلام پہلے رسُولِ امین ہیں، یعنی آپ ؑ کے پاس لوگوں کی رُوحانی امانتیں تھیں کہ اگر لوگ خوفِ خُدا اور تقویٰ اختیار کر کے اپنے پیغمبر ؑ کی اطاعت کرتے تو ان کو رُوحانیّت کے سارے خزانے مل جاتے۔

رسولوں کے پاس لوگوں کی امانتیں محفوظ ہونے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ عالمِ بالا کے ساتھ انسانیت کا کوئی نہ کوئی تعلق رہا ہے، ورنہ امانت کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا، جیسے آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ: اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ (حکمت مومن کی گم گشتہ چیز ہے) امانت ہو یا متاعِ گم شدہ، دونوں میں تعلقِ پیشین کا تصوّر ملتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ امین تھے

سورۂ قصص (۲۸) رکوع ۳ میں دیکھئے: یہاں حضرت موسیٰؑ حضرت شعیبؑ کی دو بیٹیوں کی بکریوں کو پانی پلاتے ہیں، جن کی مراد دو روحانی اور ذرّاتِ لطیف ہیں، اس مقام پر آپؑ کی ذرّاتی ہستی کی تشبیہہ مدین کے پانی سے دی گئی ہے، ذرّاتی ہستی کا مطلب روحِ حیوانی ہے، اور قرآنِ حکیم میں اس کی قربانی کی مختلف مثالیں بیان ہوئی ہیں، چنانچہ حضرت ہابیلؑ کی قربانی میں اسی کی طرف اشارہ ہے (۵/۲۷) قربانیٔ سوختنی کے ذکر میں اسی کی حکمت پوشیدہ ہے (۳/۱۸۳) چار پرندوں کی قربانی میں یہی چیز ہے (۲/۲۶۰) حضرت اسماعیلؑ کا دنبہ بھی یہی ہے (۳۷/۱۰۷) وغیرہ۔

حضرت موسیٰؑ کو قوی اور امین (۲۸/۲۶) کہنے کا مطلب صرف یہی نہیں کہ آپؑ نے اُن دو صاحبزادیوں کی بھیڑ بکریوں کو پانی پلایا، بلکہ اُن کی اصل قربانی اور عظیم نمونۂ عمل یہ ہے کہ آپ نے آٹھ یا دس

برس تک ذرّاتِ ارواح کی چرواہی کی، جس کی مثال قرآن میں موجود ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام رسولِ امین تھے، جس طرح قرآن میں ہے: اور ان سے پہلے ہم نے قومِ فرعون کی آزمائش کی اور ان کے پاس ایک عالی قدر پیغمبر (موسیٰؑ) آئے (اور کہا) کہ خدا کے بندوں (بنی اسرائیل) کو میرے حوالے کر دو میں (خدا کی طرف سے) تمہارا ایک امانتدار پیغمبر ہوں اور خدا کے سامنے سرکشی نہ کرو میں تمہارے پاس ایک واضح و روشن دلیل لے کر آیا ہوں (۴۴/۱۷-۱۹)

تمام پیغمبرؑ امین تھے

قرآن مجید کا کہنا ہے کہ جس طرح حضرت نوحؑ اپنے زمانے میں امین تھے، اسی طرح حضرت ہودؑ (۲۶/۱۲۵) حضرت صالحؑ (۲۶/۱۴۳) حضرت لوطؑ (۲۶/۱۶۲) حضرت یوسفؑ (۱۲/۵۴) اور حضرت شعیبؑ بھی (۲۶/۱۷۸) اپنے اپنے وقت میں امانتدار تھے، یعنی ان حضرات کے پاس بشرطِ تقویٰ و اطاعت علم و حکمت اور روحانی دولت کے خزانے امانت رکھے ہوئے تھے۔

روح الامین

ترجمۂ فرمانِ خداوندی: قرآن کو روح الامین (جبرائیلؑ) لے کر آپ کے دل پر نازل ہوا ہے تاکہ آپ ڈرانے والوں کی طرح ڈرائیں، یہ صاف عربی زبان میں ہے، اور یہ اگلے پیغمبروں کی کتابوں میں بھی

ہے (۲۶/۱۹۳-۱۹۶) جس طرح انبیائے کرامؑ لوگوں کے حق میں امانتدار اور امانت گذار ہوا کرتے تھے، اِسی طرح رُوح الامین پیغمبروں کا امانتگذار تھا، ہاں اس میں بڑا فرق یہ تھا کہ رسُولوں نے تقویٰ اور خُدا کی اطاعت سے اپنی تمام تر امانتیں حاصل کر لیں، مگر لوگوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔

قرآن کسی بھی ظاہری اور مادّی صورت میں نازل نہیں ہوا، بلکہ اسے امانت گذار رُوح لے کر آپؐ کے قلبِ مبارک پر نازل ہوئی، اِس رُوحُ الامین کو جبرائیلؑ (۲/۹۷) رُوح القدس (۱۶/۱۰۲) رُوحاً (۴۲/۵۲) اور نوراً (۴۲/۵۲) بھی کہا گیا ہے۔

جنّات میں بھی امین ہیں

قرآنِ حکیم میں ہے کہ: جنّات میں سے ایک عفریت (قوی) نے کہا کہ قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اُٹھیں میں تخت آپ کے پاس لے آؤں گا اور میں اس پر قابو رکھتا ہوں اور امین بھی ہوں (۲۷/۳۹) آپ باور کریں گے کہ قرآنِ حکیم کی زبانِ خاص زبانِ حکمت ہوا کرتی ہے، لہٰذا یہاں جنّ سے مخلوقِ لطیف مُراد ہے، اور وہ حدودِ دین کی ایک عظیم ہستی تھی، چُنانچہ حکمتِ قرآن کے مطابق ملکۂ سبا کا تخت (جُثّۂ ابداع) دو دفعہ حاضر کیا گیا تھا۔

جنّت امین ہے

ارشاد فرمایا گیا ہے : بیشک متّقی لوگ امن کی جگہ (یعنی) باغوں اور چشموں میں ہوں گے، ریشم کی (بھی) باریک اور (کبھی) دبیز پوشاکیں پہنے ہوئے ایک دُوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے ایسا ہی ہوگا (کذالک ۵۴-۵۱ / ۴۴) مقامِ امین کے معنی امن کی جگہ بھی ہیں اور امانتدار جگہ بھی، کیونکہ بہشت دُنیا کے باغ کی طرح بے جان اور بے عقل نہیں، اِس کی تو اعلیٰ رُوح اور اعلیٰ عقل ہے، یعنی وہ بصورتِ شخصیّت ہے، لہٰذا جنّت امن کی جگہ بھی ہے اور امانتدار و امانتگذار بھی ہے۔

باغ کا انحصار پانی پر ہوتا ہے، اِسی طرح بہشت کے باغوں کا دارومدار چشموں پر ہے، وہ چشمے وہی ہیں جو بہشت کی چار نہریں ہیں، یعنی عقلِ کُلّ، نفسِ کُلّ، ناطقؐ اور اساسؑ، اصل انسان رُوح ہے اور اس کا جسم بدرجۂ لباس ہے، ریشمی لباس کا ذکر صرف اِس لئے نہیں کہ وہ عمدہ اور نرم ہے، بلکہ وہ خلقِ جدید (خلقِ جدید کا تذکرہ قرآن میں دس جگہ ہے)، یعنی جُثّۂ ابداعیہ کی علامت (SYMBOL) ہے، کیونکہ ریشم ایک ایسی مخلوق کی پیداوار ہے کہ اس میں ابداع کی مثال موجُود ہے، اور یہ بھی یاد رہے کہ قرآنِ حکیم میں جہاں جہاں "کذالک" کا لفظ آیا ہے وہاں کوئی بڑا راز موجُود ہوتا ہے۔

قلمِ الٰہی امین ہے

سورۂ تکویر (۸۱) میں ہے: بیشک یہ (قرآن) ایک معزّز رسُول (فرشتہ) کا قول (لایا ہُوا پیغام) ہے جو بڑا قوی عرش کے مالک کی بارگاہ میں بلند رُتبہ ہے، اُس کی اطاعت کی جاتی ہے (اور) پھر امانتدار ہے اور تمہارے ساتھی (یعنی آنحضرتؐ) مجنون نہیں ہیں اور اُنہوں نے "اُس کو" اُفقِ مُبین پر دیکھا ہے اور وہ غیب کی باتوں کے ظاہر کرنے میں بخیل نہیں (۸۱ ۱۹-۲۴)

یہاں ظاہری روایت کے مطابق رسُول سے مُراد جبرائیلؑ کو لیا گیا ہے، لیکن ہمیں فراغدلی سے سوچنا چاہیئے کہ یہاں جبرائیل کا نام نہیں ہے، اگر ہم قلمِ الٰہی کو ایک زندہ حقیقت اور سب سے بڑا فرشتہ مانتے ہیں تو یہاں جو صفات بیان کی گئی ہیں، اُن کا صحیح اطلاق اُس عظیم فرشتے پر ہو سکتا ہے، چنانچہ ہم قبول کرتے ہیں کہ قرآن قلمِ الٰہی کا قول ہے وہ بڑا معزّز فرشتہ ہے، جو بڑا طاقتور ہے اور صاحبِ عرش کا انتہائی مقرّب ہے بحکمِ خدا سب اُس کی اطاعت کرتے ہیں، اور یقیناً آنحضرتؐ نے "اُفقِ مُبین" (اُفقِ مُبین ایک خاص اشارہ ہے) کے مقام پر اُس کو دیکھا ہے، اور قرآن کے نزُول کا آغاز قلمِ قدرت سے ہونے کے باب میں یہ ارشادِ نبوی ہے:-

اِنّی آخذُ الوحیَ عن جبریل، وجبریل یأخذہ عن میکائیل، ومیکائیل:

يأخذه عن اسرافيل، واسرافيل يأخذه
عنِ اللّوحِ، واللّوح يأخذه عن القلم[1]

میں وحی جبرائیل سے حاصل کرتا ہوں، جبرائیل اسے میکائیل سے لیتا ہے، میکائیل اسے اسرافیل سے لیتا ہے، اسرافیل اسے لوح سے لیتا ہے، اور لوح قلم سے لیتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل فرشتے ہیں اسی طرح لوح و قلم بھی فرشتے ہیں، بلکہ لوح تو رُوحِ ارواح یعنی نفسِ کُلّ ہے اور قلم عقلِ عقول یعنی عقلِ کُلّ ہے۔

شہرِ امن (بلدِ امین)

اللہ تبارک و تعالیٰ کا پاک فرمان ہے: وَهٰذَا البلد الامین (۹۵/۳) اور اس امن والے شہر کی قسم۔ اس کی تاویلی حکمت یہ ہے کہ شہرِ امن اساس یعنی مولا علی صلوات اللہ علیہ وسلامہ ہیں، کہ خدا تعالیٰ نے سورۂ تین کے آغاز میں عقلِ کُلّ، نفسِ کُلّ، ناطقؑ، اور اساسؑ کی جس طرح قسم کھائی ہے، اس میں اساسؑ شہرِ امن ہیں، اور یہ حکمت اس معنی میں ہے کہ جو شخص مشاہدۂ رُوحانیت کے سلسلے میں مرتبۂ اساس کی شناخت کو حاصل کر لیتا ہے، وہ گویا امن

---

[1] بحوالۂ اساس التاویل، فصل اوّل

والے شہر میں داخل ہو جاتا ہے، جہاں بحقیقت خانۂ خُدا موجود ہے، لہٰذا اُس کو امن ملتا ہے اور اُس کو عالمِ بالا کی امانتیں بھی ملتی ہیں، کیونکہ لفظ امین کے جتنے معنی ہیں وہ اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

امن جنگ نہ ہونے یعنی صُلح کی صورت کا بھی نام ہے اور امن حصولِ فتح کا نتیجہ بھی ہے، چنانچہ یہاں جس امن کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ فتح کے نتیجے میں ہے، وہ اِس طرح کہ ہادیٔ برحق کے عالمِ شخصی میں دُنیا بھر کے لوگ بشکلِ ذرّاتِ لطیف داخل ہو جاتے ہیں، یہ دینِ خُدا کی فتح ہے، جیسا کہ ارشاد ہُوا ہے: اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ط اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (۱۱۰: ۱-۳) (اے رسولؐ) جب خُدا کی مدد آپہنچے گی اور (رُوحانی) فتح ہو جائے گی اور آپؐ لوگوں کو دیکھیں گے کہ سب لوگ خُدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو آپؐ اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرنا اور اسی سے مغفرت کی دُعا مانگنا، بیشک وہ توّاب ہے۔

نصر یعنی جبرائیلؑ خُدا کی طرف سے زندہ اور عملی مدد ہے، اور فتح یعنی میکائیلؑ عملی فتحمندی ہے، اِس سے پُوری دُنیا کی رُوحانی فتح مُراد ہے، دینِ خُدا انسانِ کامل ہے، جس کی شخصیّت میں تمام اہلِ جہان کی رُوحیں قبولِ اسلام کے طور پر داخل ہو جاتی ہیں، پروردگار کی حمد میں تسبیح کرنا یہ ہے کہ بقدرتِ خُدا انسانِ کامل کی جملہ ہستی جو

ذاتی اور بیرونی ذرّاتِ اَرواح سے مملو ہے ربّ عزّت کی حمد و تسبیح سے گونج اُٹھتی ہے، استغفار یہ ہے کہ ایسی فتح تک خود کو پہنچا کر بخشش حاصل کی جاتی ہے اِس لئے یہ آخری عملی استغفار ہے توّاب کے معنی یہ ہیں کہ اُس روز عابد و معبود ایک دُوسرے کے انتہائی قریب ہو جاتے ہیں۔

خُلاصۂ بارِ امانت

اِس مضمون کے آغاز میں بارِ امانت کا تذکرہ کرتے وقت چند سوالات پیدا ہوئے تھے، اور سب سے پہلے یہ کہ وہ امانت کیا چیز ہے جس کا ذکر قرآن (۳۳/۷۲) میں فرمایا گیا ہے؟ اِس بارے میں عرض یہ ہے کہ وہ امانت جس کے اُٹھانے سے کائنات ڈر گئی، اور جس کو آخرکار اِنسان نے اُٹھایا، وہ "اختیار" ہے، کیونکہ انسان میں صرف اختیار ہی ایک ایسی صلاحیت ہے جسے ایک مُعیّن وقت کے بعد لوٹا دیا جاتا ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ قرآنِ حکیم میں جہاں جہاں "توکّل" کا ذِکر آیا ہے، وہاں اختیار کی امانت رفتہ رفتہ اپنے حقیقی وکیل کو واپس کرنے کی بات ہے، ہاں یہ بات درست ہے کہ ایمان کے درجۂ کمال پر اختیار کی امانت کا بوجھ بالکل ہلکا ہو جاتا ہے۔

اگر سماوات، ارض اور جبال سے یہ ظاہری کائنات مُراد لیں، تو اسے اختیار کا یہ بوجھ اس لئے نہیں اُٹھانا چاہیئے کہ

اس میں دیگر صلاحتیں نہیں ہیں، جیسی عقل، جان وغیرہ، اور اگر سات آسمان سے ناطقان، سات زمین سے اساسان، اور پہاڑوں سے ائمہؑ مُراد لیں، تو انہیں بھی یہ بارِ امانت ذاتی اعتبار سے نہیں اُٹھانا چاہیئے کیونکہ وہ حضرات مقامِ توکّل پہ ہیں، یعنی وہ یہ بوجھ اُٹھاکر اس سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔

اَب رہا یہ سوال کہ وہ اِنسان جس نے یہ امانت اپنے ذمّہ اُٹھالی تھی کیونکر ظلُوم و جہُول کہلاتا ہے؟ جواب عرض ہے کہ اگرچہ اِنسان بحیثیتِ مجموعی اِنسان کہلاتے ہیں، تاہم اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ انبیاء، واولیاءؑ اور عوام النّاس ایک جیسے ہیں، کیونکہ خُداوند تعالیٰ نے اپنے دوستوں کو ظلم و جہالت سے دُور رکھا ہے، اور ان کو دُنیائے اِنسانیّت کے لئے "امین" بنایا ہے، تاکہ لوگ اِس بارِ امانت کے اُٹھانے میں ان حضرات کی مکمّل مدد حاصل کریں، وہ اِس طرح کہ تمام دینی امُور کے اختیار کو انہیں کے سپُرد کردیں، تاکہ وہ حضرات نُورِ ہدایت کے وسیلے سے کمزور انسانوں کے اِس بوجھ کو بٹائیں، لیکن لوگوں کی اکثریت نے کامل اِنسانوں کو نہیں پہچانا، جو خُدا کی طرف سے امین تھے، یہی وجہ ہے کہ کچھ اِنسان اپنے حق میں ظلم کرنے والے اور جاہل قرار پائے۔

آپ کا علمی خادم
نصیر الدین نصیر ہونزائی
لندن ۲۳ راگست ۱۹۸۳ء

قصۂ مریمؑ سے متعلق

۲۰ سوالات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ حضرت بی بی مریم علیہا السلام قرآنِ حکیم کی اُن عظیم المرتبت، بابرکت، نورانی اور پاکیزہ ہستیوں میں سے ہیں، جن کی حیاتِ طیبہ کا تذکرہ بڑے تقدس سے فرمایا گیا ہے، یہاں ان کی مثالی زندگی کی کچھ حکمتیں بذریعۂ سوال وجواب واضح کردینے کے لئے کوشش کی جاتی ہے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

سوال نمبر ۱: حضرت مریمؑ کے والدِ بزرگوار کا کیا نام تھا؟ ان کی والدۂ محترمہ کی کیا خصوصیات تھیں؟ مریمؑ کا نام کس نے رکھا؟ آپ کے حق میں آپ کی مادرِ مشفقہ نے ربِّ عزّت کے حضور سے کیا دعا مانگی؟

جواب: بی بی مریمؑ کے والدِ محترم کا اسمِ گرامی عمران تھا، ان کی والدہ محترمہ کا نام حنّہ بنتِ فاقوذ، آپ کے والدین خداپرست اور خدا رسیدہ تھے، مریم کا نام اُن کی والدہ نے رکھا، اور انہوں

نے نہ صرف بی بی مریمؑ کو بلکہ اُن کی ذُرّیت کو بھی شیطانِ رجیم کی بُرائی سے محفوظ رکھنے کے لئے پروردگار سے دُعا مانگی۔

سوال ۲: شیطانِ رجیم کے لفظی اور تاویلی معنی بتایئے، اُعِیذُھَا بِکَ سے کیا مُراد ہے؟ اَنۡبَتَھَا نَبَاتاً حَسَناً میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

جواب: شیطانِ رجیم کے لغوی معنی ہیں پتھراؤ کرنے والا شیطان اور اس کی تاویل ہے وہ شخص جو مومن کی طرف پتھر جیسے بیجان مسائل پھینک کر اس کی رُوح الایمان کو ہلاک کرنے کی کوشش کرتا ہے، اُعِیذُھَا بِکَ کے معنی ہیں: میں اس بچّی کو تیری پناہ میں دیتی ہوں، یعنی حدُودِ دین کی حفاظت میں رکھتی ہُوں تاکہ شیطان کی باتیں اس پر اثر انداز نہ ہو سکیں، اَنۡبَتَھَا نَبَاتاً حَسَناً (۳۷/۳) میں یہ اشارۂ حکمت مقصُود ہے کہ جس طرح دُنیا کی نباتات گوناگون ہُوا کرتی ہیں، یعنی وہ اچھی سے اچھی بھی ہیں اور بُری سے بُری بھی، چنانچہ خُداوند پاک نے مریمؑ کی شخصیّت بڑی پاکیزہ بنائی، جس طرح کامل انسانوں کی شخصیّتیں ہر طرح سے پاک و پاکیزہ بنائی جاتی ہیں۔

سوال ۳: مریم کی کفالت کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کس نے مریم کی کفالت کی اور اس کفالت سے کیا مُراد ہے؟

جواب: چونکہ مریم بنامِ خُدا مذہبی خدمت کی خاطر نذرانہ تھیں، ہر چند کہ لڑکی کی یہ نذر خلافِ رواج تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے

اسے قبول فرمایا، اور حضرت ذکریا علیہ السّلام امامِ مستودع نے اس بچّی کو اپنی کفالت میں لے لیا، جس سے اخلاقی، دینی اور رُوحانی پرورش مُراد ہے، پس بی بی مریمؑ بحکمِ خُدا ایک ایسی پاک ہستی کی تعلیم و تربیّت کی پیداوار ہیں کہ وہ پیغمبر بھی تھے اور امام بھی، یعنی حضرت ذکریا علیہ السلام۔

سوال ۴: محراب کے کیا معنی ہوتے ہیں اور قرآنِ حکیم میں اس کی کیا حکمت ہے؟ رزق کی کیا تاویل ہے؟

جواب: محراب کا لفظ حرب سے ہے، حرب جنگ اور لڑائی کو کہتے ہیں، اور محراب وہ جگہ ہے جہاں بیٹھ کر دشمن کے خلاف لڑائی کی جاتی ہے، اور قرآنِ پاک میں اس کی تاویل مقامِ پیشانی ہے کہ انبیائے کرام اور اولیائے عظّام کی عملی رُوحانیّت اور ذکر و بندگی اسی میں ہوتی ہے اور یہی وہ قلعۂ خُداوندی ہے، جہاں بحقیقت ہر مومن کو نہ صرف مکمّل پناہ ملتی ہے بلکہ وہ شیطان کے خلاف جنگ بھی کر سکتا ہے، رزق کی تاویل رُوحانی علم ہے۔

سوال ۵: قرآنِ مقدّس (۳/۴۲) میں فرمایا گیا ہے کہ خُدا نے مریمؑ کو برگزیدہ کیا تھا، وہ پاک و پاکیزہ کی گئی تھیں، اور دُنیا بھر کی عورتوں سے منتخب ہُوئی تھیں، سو مریمؑ کی برگزیدگی، پاکیزگی اور انتخاب کی حکمت بیان کیجئے۔

جواب: آیۂ کریمہ میں سب سے پہلے برگزیدگی کا ذکر ہے، جس کی مُراد یہ ہے کہ مریمؑ کو لوگوں پر فوقیت دے کر رُوحانی تعلیم و

تربیت اور اسمِ اعظم عنایت کیا گیا، پھر اُن کی رُوحانی اور عقلی پاکیزگی ہُوئی، اور پھر اسی عمل کے نتیجے میں زمانہ بھر کی عورتوں سے اِس مقصد کے لئے منتخب ہُوئیں کہ اُن سے ایک عظیم پیغمبر پیدا ہوں، اس میں خاندانِ نبوّت و امامت کی برگزیدگی اور پاکیزگی سے متعلق مثالی بیان موجُود ہے۔

سوال ۶ : جب بیت المقدّس کے عابدوں کے آپس میں جھگڑا سا ہُوا، کیونکہ ہر ایک کی یہ تمنّا تھی کہ حضرت مریمؑ کی کفالت کرے، تو یہ طے ہُوا کہ وہ لوگ اپنے قلموں کو پانی میں ڈالیں، جس کا قلم پانی کی سطح پر تیرتا رہ جاتے، وہی مریمؑ کی کفالت کرے گا، یہاں قلم کے ایسے معجزے کی کیا تاویل ہے؟

جواب : تاویلی زبان میں قلم عقل کو کہا جاتا ہے، چنانچہ مریمؑ کی کفالت کے بارے میں اُن عابدوں نے جیسی جیسی دلیلیں پیش کیں، اس میں ان کی عقلیں علم کے پانی میں ڈوب کر رہ گئیں، مگر حضرت ذکریاؑ ہی کی عقل تھی جو علم کی بلندی پر نمایاں ہوگئی۔

سوال ۷ : سورۂ آلِ عمران (۳/۴۵) کے مطابق: "جب فرشتوں نے (مریمؑ سے) کہا اے مریمؑ خدا تم کو اپنے ایک خاص کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسٰے ابنِ مریم ہوگا (اور) دُنیا و آخرت میں وجیہہ اور مقرّبین میں سے ہوگا" یہاں یہ پُوچھنا ہے کہ حضرت عیسٰےؑ کس معنیٰ میں کلمہ ہیں؟ مسیح کی کیا تاویل ہے؟ لفظ

وَجِیہاً میں کیا اشارہ ہے؟ اور مقرّبین کی کیا حدّ ہے؟

جواب: حضرت عیسےٰعؑ اللہ پاک کے حضورِ خاص سے ایک کلمہ اِس معنیٰ میں تھے کہ نورِ نبوّت و امامت نہ صرف درخت کی طرح شخصیّت ہی میں ہوتا ہے، بلکہ یہ پھل کی طرح اسمائے عظّام اور کلماتِ تامات میں بھی موجود ہُوا کرتا ہے، مسیح کے لفظی معنی ہیں مسح کرنے والا، یعنی ہاتھ پھیرنے والا، جس کی تاویل جثّۂ ابداعیّہ اور اس کا ہمہ رس معجزہ ہے، وَجِیہاً کے مرادی معنی ہیں وسیلۂ معرفت، مقرّب بدرجۂ انتہا قریب اور واصل باللہ کے معنی میں ہے۔

سوال ۸: حضرت عیسےٰعؑ نے مہد یعنی بچھونے میں سے کس طرح لوگوں سے باتیں کیں، اور بڑی عمر کا ہو کر کس طرح؟

جواب: انسانِ کامل دو مقام پر لوگوں سے باتیں کرتا ہے: عالمِ ذرّ میں، اور دُنیائے ظاہر ہیں، چنانچہ جب حضرت عیسےٰعؑ اپنی ماں کے عالمِ شخصی میں تھے، تو اُس وقت آپؑ عالمِ ذرّ میں تھے، جہاں وہ لوگوں سے باتیں کیا کرتے تھے، جس کی مثال جھُولے میں سے باتیں کرنے سے دی گئی ہے، جیسے آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ: "تم بچھونے سے لے کر قبر تک علم کو حاصل کرتے رہو۔" بچھونا عالمِ ذرّ ہے اور قبر حدودِ دین میں سے کوئی ہوتا ہے، اور بڑی عمر کا ہو کر حضرت عیسےٰعؑ کا لوگوں سے باتیں کرنا یہ ہے، کہ آپؑ نے اِس دُنیا میں لوگوں سے باتیں کیں۔

سوال ۹: مطالعۂ قرآن سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ انبیائے کرام کی پاکیزہ زندگی سے متعلق جو جو صفات بیان کی گئی ہیں، ان کی پُرحکمت ترتیب میں بعض دفعہ لفظِ صالحین آخر میں آتا ہے، اس میں کیا راز پوشیدہ ہے؟ جیسا کہ قرآن (۳/۴۵) میں ہے۔

جواب: اس دُنیا میں شروع سے لے کر اب تک لشکرِ شیطان اور لشکرِ رحمان کے درمیان جنگ کا سلسلہ جاری ہے، شیطان کے لشکر میں جتنے لوگ داخل ہیں، اُن میں بعض جسمِ لطیف رکھتے ہیں اور بعض جسمِ کثیف، قرآنِ حکیم نے لطیف کو سوار اور کثیف کو پیادہ کہا ہے (۱۷/۶۴)، اب خدائی لشکر کے بارے میں سُنئے کہ اس میں بھی لطیف و کثیف دونوں قسم کے جسم میں لاتعداد سپاہی موجود ہیں، یہاں لطیف کا نام آسمانی فوج ہے اور کثیف کا نام ارضی فوج (۴۸/۷) پس قرآن میں جہاں لفظ "صالحین" مذکورہ انداز میں آیا ہے، تو اس کا اشارہ جسمِ لطیف کی طرف ہے، وہ یہ کہ انبیاؑ و اولیا جسمِ لطیف میں صالحین کہلاتے ہیں، اور وہ روحانی لشکر میں شریک ہیں (۵۸/۲۱)

سوال ۱۰: کبھی ظاہر و باطن دونوں میں اور کبھی صرف باطن میں امامِ زمانؑ کے علاوہ حدودِ دین یعنی درجات ہوا کرتے ہیں، اس اعتبار سے حضرت مریمؑ کا کیا درجہ تھا؟ کیا وہ پیغمبرانہ مرتبہ رکھتی تھیں، شاید اس لئے کہ فرشتوں نے اُن سے کلام کیا؟ آیا آپؑ

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

درجۂ امامت پر فائز ہو چکی تھیں؟ اور اگر نہیں تو پھر اُن کا کیا درجہ تھا؟

جواب: حضرت مریمؑ علیہا السّلام نہ تو کوئی پیغمبر تھیں اور نہ ہی امام، کیونکہ قانونِ حکمت یہی رہا ہے کہ انبیا و ائمہؑ رجال میں سے ہوں، لہٰذا بی بی مریمؑ حُجّت کا مرتبہ رکھتی تھیں، جبکہ آپؑ بقولِ قرآن (۵/۷۵) صِدّیقہ تھیں، صدّیقہ کا کیا مطلب ہوتا ہے وہ بھی قرآنِ حکیم میں موجود ہے، آپ سورۂ تحریم (۶۶) کی آخری آیت میں دیکھ سکتے ہیں، کہ مریم کے باطن میں رُوح القدس رُوحانیّت اور علم و حکمت کا کام کرتی تھی، اِس لئے اُنہوں نے اپنے عالمِ شخصی میں اسمائے عظام اور کلماتِ تامات کی شناخت اور تصدیق کی، اور ظاہراً و باطناً آسمانی کُتب کی بھی علمی اور عرفانی تصدیق کی۔

سوال ۱۱: اگر یہ کُلیّہ مان لیا جائے کہ بی بی مریمؑ اپنے وقت میں ایک مقرّب حُجّت تھیں، تو پھر اُس صورت میں زمانۂ ماضی کے ہمارے حُجّتوں یا پیروں کی رُوحانی اور علمی مرتبت کو سمجھنے کے لئے حضرت مریمؑ سے کیا کیا مثالیں مل سکتی ہیں؟

جواب: ہماری زرّیں تاریخ کے عظیم حُجّتوں اور پیروں کی اعلیٰ رُوحانیت اور علم و معرفت کی تمام تر مثالیں اُس قِصّۂ قرآن سے مل سکتی ہیں، جو مریم علیہا السّلام سے متعلق ہیں، اور اِس قصّے کا خاص مقصد بھی یہی ہے، کیونکہ قرآن میں ماضی کی جتنی مثالیں بیان کی گئی ہیں، اُن کا رُخ مستقبل کی طرف ہے، جیسی کوئی صاف و

شفاف اور شیریں ندی اہلِ زمانہ کی طرف بہتی ہو، چنانچہ مریمؑ کے آئینۂ مثال میں ہم اپنے بزرگانِ دین کی رُوحانیت کو سمجھ سکتے ہیں، یہ قصّہ اس اعتبار سے عظیم حکمتوں کا خزانہ ہے۔

سوال ۱۲ : یہ تو مان لیا کہ مریم عظیم حُجتّوں اور پیروں کی مثال ہیں، لیکن جس طرح بی بی مریمؑ نے ایک عظیم پیغمبر کو جنم دیا ہے، اس کی مثال ہمارے بزرگوں میں کیا ہے؟

جواب : حضرت مریمؑ جس حیثیت میں ایک خاتون تھیں اس کا یہاں ذکر نہیں ہے، مگر آپؑ جس معنیٰ میں حُجّت اور امام کی رُوحانی بیوی تھیں، اسی کی بات ہے، اور یہی مثال بزرگانِ دین کی بھی ہے، جنہوں نے بی بی مریمؑ کی طرح زمانے کے نُور کو عالمِ شخصی میں اور دُنیائے دعوت میں جنم دیا، ہاں یہ سچ ہے کہ نُور کا ایک پہلو نہیں بلکہ بہت سے پہلو ہیں، اس کا ایک رشتہ نہیں بلکہ بہت سے رشتے ہیں، اور قرآنِ پاک میں یہی حقیقت مذکور ہے: "جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اسی طرح پیغمبرؐ کو پہچانتے ہیں۔" (۲/۱۴۶)

سوال ۱۳ : ترجمۂ آیۂ کریمہ ہے : " اور ہم نے مریمؑ کے بیٹے (عیسیٰؑ) اور ان کی ماں کو (اپنی قدرت کی) نشانی بنائی تھی اور ان دونوں کو ہم نے ایک اُونچی ہموار ٹھہرنے کے قابل چشمہ والی زمین پہ جگہ دی" (۲۳/۵۰)، یہ بلند جگہ (ربوۃ) ٹھہرنے کے قابل (ذاتِ قرار)

اور چشمہ (معین) کیا ہیں؟

جواب: رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ (٢٣/٥٠) ایسی بلند جگہ جہاں بندۂ مومن کے لئے قرار اور علم کا سرچشمہ ہے، وہ عالمِ شخصیّت میں مرتبۂ پیشانی ہے، جس میں رُوحِ انسانی کا مرکز ہے، اور جہاں رُوحِ قدسی جلوہ افروز ہو جاتی ہے اور جسے نور کہا جاتا ہے۔

سوال ١٤٧: قرآنِ حکیم کا کہنا ہے کہ انسان کی جسمانی تخلیق کے سات مراحل ہیں: سُلالہ، نُطفہ، علقہ، مُضغہ، عِظام، لحم اور خلقِ آخر (٢٣/١٢-١٤) اِس لحاظ سے آدمی گویا سات مرتبہ پیدا ہوتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اسی قانونِ فطرت کے مطابق رُوحانی تخلیق وتکمیل کے بھی سات مراحل ہیں، لہٰذا حضرت مریمؑ نے رُوحانیّت کی سات منزلوں پر حضرت عیسیٰؑ کو گویا سات بار جنم دیا، تو کیا یہ مثال دُرست ہے؟

جواب: جی ہاں، یہ مثال بالکل دُرست ہے، کیونکہ عالمِ دین جس طرح چھ عظیم المرتبت پیغمبروں اور حضرت قائم (٦+١=٧) سے مکمّل ہوا ہے، اِسی طرح شخصی عالم کی رُوحانیت بھی سات منزلوں سے گزر جانے کے بعد مکمّل ہو جاتی ہے، یعنی رُوحانیت حضرت آدمؑ کی مثال سے شروع ہو کر قائم القیامت تک پہنچ جاتی ہے، پس یہ بات صرف حضرت عیسیٰؑ کے لئے خاص نہیں بلکہ

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

تکمیلِ نُور کا قاعدہ ہی یہی ہے۔

سوال نمبر ۱۵ : حضرت مریمؑ اگر ایک طرف پیروِ حجّت کی مثال ہیں تو دُوسری طرف آپؑ دُنیا بھر کی عورتوں کے لئے مذہبی اور رُوحانی عظمت و بزرگی کا اعلیٰ نمونہ بھی ہیں، کیا آپ اِس سلسلے میں کچھ وضاحت کریں گے؟

جواب : جی ہاں، حضرت مریم علیہا السّلام کی پُرحکمت مثال میں اللہ تعالیٰ نے تمام مردوں اور عورتوں کو رُوحانی ترقی کی یکسان دعوت دی ہے، کیونکہ آپؑ رُوحانیت کے اُس مقام پر کھڑی ہیں، جو پیغمبرؐ اور امامؑ کے بعد کا درجہ ہے، جو سب کے لئے مشترک اور ممکن ہے، اور اِس نمونۂ عمل میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے، کہ کامیاب مومنین و مومنات باطن اور روحانیت میں کس طرح نورِ امامت کے ساتھ مل جاتے ہیں۔

سوال نمبر ۱۶ : قرآنِ حکیم میں فرعون کی بیوی کے نہ صرف مومنہ ہونے کا ذکر ہے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ ان کو بی بی مریم کی قطار میں بھی لایا گیا ہے (۶۶/۱۱) تو کیا آپ متعلقہ آیۂ مقدسہ کی کوئی تاویلی حکمت بیان کرسکیں گے؟

جواب : فرعون کی بیوی کے بارے میں قرآنی ارشاد ہے :

اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَکَ بَیْتًا فِی الْجَنَّۃِ (۶۶/۱۱) جب اُس نے دُعا کی پروردگارا! میرے لئے بہشت میں اپنے نزدیک ہی

ایک گھر بنا دے"۔ یہ دُعا کئی اعلیٰ حکمتوں پر مبنی ہے، ایک تو یہ ہے کہ اس میں دیدارِ خُداوندی اور انتہائی قرب و حضور کا تصوّر ہے اور دُوسری حکمت یہ ہے یہ کہ یہاں بہشت کی تخلیق و تعمیر کا ذکر ہے، اِس سے ظاہر ہے کہ وہ خاتُون خُداوند تعالیٰ اور جنّت کو پہچان چکی ہیں، اِس لئے ایسی دُعا کرتی ہیں، اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ ایسی دُعا نہ کر سکتیں، اگر کوئی ایسی بات کہی جاتی، جو حکمتِ قرآن کے خلاف ہو، تو وہ حصّہ آیت نہ بن سکتی، یا وہ بات نمونۂ باطل کے طور پیش ہو جاتی، مگر ایسا نہیں ہے، پس معلوم ہُوا کہ فرعون کی بیوی اہلِ معرفت میں سے تھیں۔

سوال ۱۷: سورہ اور آیہ $\frac{66}{12}$ کے ظاہری معنی کے پیشِ نظر ایسا لگتا ہے کہ بی بی مریمؑ کی جسمانی عفّت و پاکدامنی کی بدولت آپؑ میں خُدا کی رُوح پھونک دی گئی تھی، اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: جسمانی عفّت و پاکدامنی اگرچہ اپنی جگہ ضروری ہے، کیونکہ یہ خواتین کی ایک عام صفت ہے، تاہم اس کے نتیجے میں رُوحِ قدسی حاصل نہیں ہو سکتی ہے، رُوح القدس یعنی خُدا کی رُوح صرف اور صرف عِلم و حِکمت کی پاکیزہ باتوں میں پوشیدہ ہو کر کانوں کی راہ سے کسی مومن میں داخل ہو سکتی ہے، لہٰذا کانوں کو غیروں کی آلودہ باتوں سے پاک و محفوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے، اور متعلّقہ آیۂ کریمہ میں جو مثال دی گئی ہے اس کا ممثول یہی ہے۔

سوال ۱۸: آپ نے کہا تھا کہ حضرت عیسےٰؑ کا نورانی جنم رُوحانیت کے سات مقامات پر ہُوا تھا، کیا آپ اس کی کوئی مثال سمجھا سکتے ہیں؟

جواب: جی ہاں، اِنشاء اللہ، مثال کے طور پر "لِاَھَبَ لَکِ غُلٰماً زَکِیّاً (۱۹/۱۹) تاکہ تم کو پاک و پاکیزہ لڑکا عطا کروں"۔ غلامِ زکی کا یہ اشارہ نورِ عیسےٰؑ کے درجۂ کمال کی طرف جاتا ہے، نور کو تاویلاً غلام (لڑکا = بچہ) کہنا اس معنی میں بالکل دُرست ہے کہ مقامِ رُوحانیت پر نور کے جتنے ظہورات ہیں، اُن میں سے ایک ظہورِ صوتی بھی ہے، جس میں کئی آوازیں کام کرتی ہیں، اور اُن میں ایک خاص آواز ایک بچّے کی سی ہے، لفظِ زکی میں جسم اور رُوح سے بڑھ کر عقل کی پاکیزگی کا ذکر پوشیدہ ہے، یعنی نور کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ وہ عقلی اور علمی طور پر لوگوں کو پاک کرتا ہے، پس اسی بشارت کے مطابق آگے چل کر حضرت عیسےٰؑ کا آخری رُوحانی جنم ہوتا ہے، اور اور رُوحانی منزل کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "فَکُلِیْ وَاشْرَبِیْ وَقَرِّیْ عَیْناً (۱۹/۲۶) یعنی تازہ خرمے کھاؤ اور چشمہ کا پانی پیو اور نور کے دیدار سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاؤ"۔ یہاں خرما سے حکمت اور پانی سے علم مُراد ہے، اور قَرِّیْ عَیْناً کا مطلب قُرَّۃُ الْعَیْن (آنکھ کی ٹھنڈک) ہے، جو نور اور فرزند ہے، جس کا ہم مرتبہ، اعلیٰ دیدار ہوتا ہے۔

سوال ۱۹: قرآنِ پاک میں ہے کہ: "مریمؑ کے بیٹے

عیسےٰؑ مسیح خُدا کے رسُول اور اس کے کلمہ تھے جسے خُدا نے مریمؑ کی طرف اِلقاء کیا تھا، اور خدُا کی طرف سے ایک رُوح تھے (۱۷۱:۴)" آپ اس کی وضاحت کیجئے کہ کلمہ کیا ہے؟ رُوح کلمہ سے الگ کیوں ہے؟ آیا کلمہ سے کلمات مُراد ہو سکتے ہیں؟ اگر ایسا ہُوا تو رُوح کا مطلب ارواح بھی ہو سکتا ہے۔

جواب: کلمہ اسمِ اعظم ہے، جو شروع شروع میں ایک ہُوا کرتا ہے، جو مریمؑ کو عطا کیا گیا تھا، رُوح سے رُوحِ قدسی مُراد ہے، یہاں اس کا ذکر الگ اِس لئے ہے کہ یہ نتیجۃً خصُوصی عبادت کے طور پر بعد میں آتی ہے، آگے چل کر یہی ایک کلمہ کلماتِ تامات اور اسمائے عظام کی صُورت اختیار کر لیتا ہے، اور یہ رُوح بھی اگرچہ واحد ہے تاہم جمع بھی ہے۔

سوال ۲۰: بی بی مریمؑ اور حضرت عیسےٰؑ کس رُوحانیت کی راہ پر چل رہے تھے؟ اِس راہ کا کیا نام تھا؟ اِس کا آغاز کب سے ہُوا؟ حضرت عیسےٰؑ اور حضرت آدمؑ کی رُوحانیت میں کیا فرق تھا؟

جواب: بی بی مریمؑ اور حضرت عیسےٰؑ دینِ خُدا کی راہِ رُوحانیت پر گامزن تھے، اس راہ کا نام صراطِ مُستقیم ہے، اِس کا آغاز ازل سے ہے، حضرت عیسےٰؑ اور حضرت آدمؑ کی رُوحانیت ایک ہی ہے، اس میں کوئی فرق نہیں، بلکہ یُوں کہنا چاہئے کہ تمام انبیا و ائمہ علیہم السّلام رُوحانیت میں ایک ہیں، اور تمام مومنین سورۂ فاتحہ کی ربّانی تعلیم کے مطابق اِنہی حضرات کی راہِ رُوحانیت پر آگے سے آگے

چلنے کے لئے دُعا کرتے رہتے ہیں، مگر یہ سوال اِس بحث سے الگ ہے کہ آیا ہر مومن یہ جانتا ہے کہ وہ :

"اِھدنا الصّراط المستقیم۔ صِراط الّذین انعمتَ علیھم۔"

کی اِس دُعا میں کہاں تک جانا چاہتا ہے؟ صراطِ مُستقیم کی منزلِ مقصُود کیا ہے وغیرہ۔

آپ کا علمی خادم

نصیر الدّین نصیؔر ہونزائی

لندن : ۸ر اگست ۱۹۸۳ء

رُوحانیّت اور موسیقی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ - اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ - اے خالقِ کون و مکان! اے پروردگارِ انس و جان! یہ ناچار اور انتہائی مفلس بندہ تیری درگاہِ عالیہ سے ہمیشہ کی طرح تائید و نصرت کے لئے عاجزانہ دُعا کرتا ہے، کیونکہ تیری نظرِ رحمت، دستگیری اور مدد کے بغیر حقیقی اور رُوحانی علم کا کوئی کام انجام نہیں پا سکتا، خُداوندا تو دانا و بینا ہے اور تجھ سے کوئی حال پوشیدہ نہیں کہ یہ ذرّۂ کم مقدار اور ناچیز بدرجۂ انتہا عاجز و ناتوان ہے، یاربّ اپنی رحمتِ بے نہایت سے اِس بندۂ کمترین کو توفیق اور ہمّت عنایت فرما! آمین!!

سببِ تحریرِ ہٰذا یہ ہے کہ کینیڈا کے ہمارے ہوشمند و مُعزّز شاگردوں میں سے ایک عزیز نے بذریعۂ مکتوب اِس عاجز درویش سے رُوحانیّت و موسیقی کے متعلق دو بڑے اہم سوالوں کا حل طلب کیا ہے، اور اُنہوں نے پُر اُمید ہو کر کہا ہے کہ یہ کام ضرور کر کے ان کو بھیج دیا جائے، وہ دو سوال درجِ ذیل ہیں :-

۱- انسانی رُوح پر موسیقی کا کیا اثر پڑتا ہے؟

۲- آیا اعلیٰ رُوحانی تجربات کے سلسلے میں موسیقی کا کوئی کارِ منصبی یا کسی طرح کی اہمیّت ہُوا کرتی ہے؟

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں سوال بڑی عقل و دانش سے کئے گئے ہیں کہ ان کی گرفت کا پھیلاؤ عام سطح سے لے کر رُوحانیّت کی بلندیوں تک پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے وہ عزیز خود بھی سکالر ہیں اور موسیقی سے ان کو نہ صرف دلچسپی ہے بلکہ علمی تعلق بھی ہے، اب بہتر یہ ہوگا کہ عنوانِ بالا یعنی "رُوحانیت اور موسیقی" کے موضوع پر ایک مفصّل مقالہ لکھا جائے اور بالآخر اسی کی روشنی میں خلاصے کی صُورت میں جواب مہیّا کر دیا جائے، اِنشاءاللّٰہ تعالیٰ۔

اِس بات کو جان لینا ضروری ہے کہ قرآنِ پاک اور دینِ اسلام کی رُو سے اِس دُنیا کی بعض چیزیں حلال ہیں اور بعض حرام، اور کچھ اشیاء ایسی بھی ہیں کہ وہ ایک پہلو سے حلال اور دُوسرے پہلو سے حرام ہیں، مثلاً قرآنِ حکیم میں گمان کی بابت دیکھئے کہ گمان جس کو عربی میں ظنّ کہا جاتا ہے، یہ اپنے معنی سے متعلّق ایک لفظ ہے اور معنوی طور پر نہیں بدلتا، لیکن اس کے موقع استعمال اور دو مختلف رُخ (حلال و حرام) کو دیکھئے تو سہی، کہ یہ کبھی تو باعثِ ثواب ہو جاتا ہے اور کبھی سببِ گناہ بن جاتا ہے، اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ بس یہی کہ گمان سے جس طرح نیکی ہو سکتی ہے اسی طرح بدی بھی ہو سکتی

ہے، چنانچہ حسنِ ظنّ (نیک گمان) حلال ہے، اور سوءِ ظنّ (بدگمان) حرام ہے، اور یہی حال بس موسیقی کا بھی ہے، یعنی اگر یہ نیک نیّتی سے نیک مقاصد کے حصُول کے لئے ہے تو یقیناً حلال ہے، اور اگر اس کے برعکس ہے تو یہ حرام ہے۔

ہم نے اس موسیقی کی بات بتائی جو لوگوں تک پہنچی ہوئی ہے اور ان کے درمیان مستعمل ہے، مگر اُس موسیقی کا ابھی کوئی ذکر ہی نہ ہُوا، جو اپنے سرچشمۂ اصل و حقیقت میں موجُود ہے، ہاں، انشاءاللہ ہم کچھ آگے چل کر کسی قدر تفصیل سے بتائیں گے کہ موسیقی دراصل عجائبِ قدرت اور اسرارِ حکمت میں سے ہے، اور یہ ایک زیرِ دست طاقت ہے جو اصلاً رُوحانی ارتقاء کی غرض سے بنائی گئی ہے، مگر اِس دُنیائے ظاہر میں شیطان نے اپنے لشکر کے ذریعے اس کے اکثر حصّے پر قبضہ جما رکھا ہے، تاہم یہ دانشمندی نہیں کہ جو رہا سہا مقدّس حصّہ ہے اس کو بھی شیطان سے منسُوب کر کے چھوڑ دیا جائے، بلکہ مصلحت و حکمت اسی میں ہے کہ ہر حلال و پاک چیز کو شیطان سے چھین کر اُسے محروم و مایوس کر دیا جائے۔

قرآنِ عزیز کی کئی حکمت آگین آیات میں ملکوتی اور مقدّس موسیقی سے متعلّق بہت سے لطیف حکیمانہ اشارات موجُود ہیں، مگر اس کا نمایاں تذکرہ ان آیاتِ مبارکہ میں ملتا ہے، جو صورِ اسرافیلؑ اور تسبیحِ داؤدیؑ کے بارے میں ہیں، چنانچہ ہمیں اوّل حضرت اسرافیلؑ علیہ السّلام اور اس

کے صور کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے، وہ اس طرح ہے کہ خالقِ حکیم اور ربِّ کریم نے موسیقی کو یہ بڑی عزّت کیوں عطا کی کہ وہ آج رُوحانیت میں بھی اور کل قیامت میں بھی اِسی سے اپنی قدیم اور لازوال سلطنت کا اِعلان کرواتا ہے؟ (۳) صورِ اسرافیل کی اتنی زیادہ اہمیّت کس وجہ سے ہے کہ جبرائیل ؑ اور میکائیل ؑ سے بھی ایک عظیم تر فرشتہ اِس کے لئے مقرّر اور منتظر ہے؟ اِس میں کیا راز ہے، اور کون سی ایسی قیامت خیز قوّت پوشیدہ ہے، کہ جس سے وہ تمام لوگ موت کی نیند سے فوراً جاگ اُٹھیں گے، جنہیں دُنیوی زندگی میں خوابِ غفلت سے دین کی کوئی طاقت نہیں جگا سکتی تھی؟ نیز یہ سوال ہے کہ نظامِ الٰہی میں قلم اور لوح کے بعد چار مقرّب فرشتے ہیں، اُن میں سے ایک عظیم فرشتے کو موسیقی کا مُوکّل قرار دیا گیا، اور چار مشہور آسمانی کتابوں میں سے ایک کتاب مقدّس نغموں کی صُورت میں پیش کی گئی، آخر اس میں کیا حِکمت پنہاں ہے؟

جہاں تک لفظِ صور یا ناقور کے لُغوی اور ظاہری معنی کا تعلّق ہے یہ تو صرف ایک اشارہ ہے، نیز یہ اصل حقیقت پر حجاب کا کام کر رہا ہے، کیونکہ ہر حقیقت کا ایک حجاب ہُوا کرتا ہے، یہاں تک کہ خُدا خود بھی اپنی ذاتِ اقدس کے لئے حجاب اختیار فرماتا ہے چُنانچہ اُس حکمت والے نے نغماتِ ملکوتی کا نام صور یا ناقور رکھا، جس کے لفظی معنی ہیں نرسنگھا، بگل (TRUMPET) لیکن یہاں اسم

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

اور مسمّا میں آسمان زمین کا فرق ہے، اور ایسا ہونا ضروری ہے۔
اہلِ دانش اس نکتہ کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت اسرافیلؑ جس کا ایک قسم آنی اور اصطلاحی نام تَل جَدّ (خدا کی شان ۷۲/۳) ہے، اس کو یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ ایک عام اور معمولی نوعیت کا نرسنگھا بجایا کرے، مگر ہاں یہ ایک یقینی حقیقت ہے کہ وہ لاہوتی عشق کا فرشتہ ہے، لہٰذا وہ عشقِ الٰہی کا ناقور بجاتا ہے، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ خدائی عشق کی طاقت ظاہر و باطن کی جملہ طاقتوں پر بادشاہ ہے، یہی وہ قدرتِ خدا ہے، جو نہ صرف قیامت کے دن مُردوں کو زندہ کر سکتی ہے بلکہ آج بھی ایسے بہت سے مُردوں کو حقیقی حیات عطا کر سکتی ہے، کہ وہ بظاہر زندہ چلتے پھرتے ہیں، مگر اُن میں اصل رُوح نہیں۔
فرمایا گیا ہے کہ: العشقُ نارٌ یحرقُ ماسِواءِ اللہ، یعنی حقیقی عشق ایک ایسی معجزاتی آگ ہے کہ وہ اگر حاصل ہو تو یادِ خدا کو چھوڑ کر باقی تمام چیزوں کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے، سو ہر دیندار شخص کے لئے یہ ضروری ہے، کہ وہ اسرافیلؑ سے متعلق دینی حکمتوں کو سمجھے اور ٹھنڈے دل سے غور کرے کہ آیا دین کی مقدّس روایات میں کچھ ایسی پاکیزہ چیزیں بھی ہیں کہ وہ ذرا ذرا صورِ قیامت کی طرح ہوں اور اُن میں خداوندِ برحق کی انتہائی شیرین محبّت کا کوئی کرشمہ جھلکتا ہو؟
اس مادّی دُنیا میں جو لوگ دعوتِ حق سے انکار کرنے کی آخری

حد میں پہنچ جاتے ہیں تو خداوندِ عالم ان کے بارے میں فرماتا ہے کہ: صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (۲/۱۸) یہ لوگ بہرے گونگے، اندھے ہیں سو یہ اپنی گمراہی سے باز نہیں آسکتے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ جب ایسے بے شمار لوگ مرجاتے ہیں تو اور زیادہ بے حس اور بدتر ہو جاتے ہیں، لیکن اِس راز میں حیرت ہی حیرت ہے کہ خُدا کے پاس ایک ایسی انتہائی عظیم اور آخری درجے کی طاقت بھی ہے، جس سے نہ صرف بہروں کو سنانے، گونگوں کو گویا کرنے اور اندھوں کو دکھانے کا کام لیا جاسکتا ہے، بلکہ مُردوں کو بھی زندہ کیا جاسکتا ہے، اور یہ طاقت صورِ اسرافیلؑ میں نغمۂ عشقِ الٰہی ہے۔

ناقور کا نام قرآنِ پاک میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے، صور کا تذکرہ دس بار فرمایا گیا ہے، اِس کے لئے صیحۃ کا لفظ بھی ہے، جو اکثر دفعہ تباہ کُن تصوّر پیش کرتا ہے، یعنی ماضیٔ بعید میں جو نافرمان قومیں بڑی سخت آواز سے ہلاک کی گئی ہیں، اِس میں بھی صورِ اسرافیل کا زبردست معجزہ تھا۔

قرآنِ مقدّس کی جن جن آیاتِ مبارکہ میں صورِ رُوحانیت و قیامت کی معجزنمائی کا ذکر آیا ہے، اُن میں دانش مندوں کو غور و فکر کر کے اِس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ موت کی نیند سوتے ہوئے نفوس میں حیاتِ نو پھونک کر ان کو جگا دینے والی سماوی بانسری واقعی حقیقی عشق کی جان ہے، یہ بات یقیناً نورِ معرفت کی روشنی میں ہے

کہ ناقورِ حقیقت ملکوتی بانسری ہے جس کی آوازِ جان بخش آفاق و اَنفس پر مُسلّط و مُحیط ہو جاتی ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے :-

اور جب صُور پھُونکا جائے گا تو جو لوگ آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب بیہوش ہو کر گر پڑیں گے مگر وہ جس کو اللہ چاہے، پھر دُوسری دفعہ پھُونکا جائے گا تو فوراً سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے ($\frac{۳۹}{۶۸}$)۔

اَب مناسب ہے کہ اس سلسلے میں حضرت داؤد علیہ السّلام کا بھی ذکر کر دیا جائے، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ آپؑ صورِ اسرافیلؑ سے الگ نہ تھے، اِس لئے کہ یہ اِنسانِ کامل کے باطن میں مسلسل بجتا رہتا ہے، چنانچہ یہ یاد کرنا حقیقت ہے کہ جناب داؤدؑ حضرت اسرافیلؑ کے مظہر تھے، یعنی ایک طرف سے تو اسرافیل کے زیرِ اثر اور دُوسری طرف سے لوگوں پر اثر انداز تھے، دُوسرے الفاظ میں یُوں کہنا بھی صحیح ہے کہ آپؑ لوگوں کے لئے اسرافیلؑ کی ترجمانی کر دیتے تھے، کیونکہ عوام النّاس صُورِ عشق کے لاہوتی نغمات تو براہِ راست سُن ہی نہیں سکتے، وہ اِس کان میں رُوحانی کان از خود پیدا نہیں کر سکتے، اور وہ اِس آنکھ میں عین الیقین حاصل نہیں کر سکتے، لہٰذا ربِّ کریم نے حضرت داؤدؑ کی مثال میں اہلِ جہان کو یہ حُکم دیا کہ دیکھو اگر کوئی شخص خدا کی یاد و محبّت سے غافل ہو جانے کے نتیجے پر مُردہ

یا نیم مُردہ بن چُکا ہو، تو اس کے لئے بھی ایک کامیاب علاج ہمیشہ اس دُنیا میں موجُود ہے، جس کی بدولت اس کو حیاتِ تازہ عطا ہو سکتی ہے۔

خیال رہے کہ جبرائیلؑ فرشتۂ تنزیل، میکائیلؑ فرشتۂ تاویل اور اسرافیلؑ فرشتۂ عشق ہیں، چنانچہ خُداوندِ عالم نے اپنے پاک عشق کے نُور سے انبیاء و اولیا کے قلوب کو منوّر فرمایا، اور جس طرح ہر معروف پیغمبر میں بموجبِ حکمت ایک مثالی صفت نمایاں ہُوا کرتی ہے، اسی طرح حضرت داوٗد علیہ السّلام میں ربّانی عشق کی صفت نمایاں تھی، چونکہ خُدائی عشق اصلاً عالمِ لاہوت کی بلندی پر ہے، لہٰذا بطورِ کامل اس کو چھُونا انتہائی مشکل کام ہے، یہی سبب تھا کہ حضرت داوٗدؑ ہمیشہ مناجات اور گریہ و زاری میں ڈوبے رہتے تھے۔

ویسے تو انسان اپنی ہستی میں بے شمار چیزوں کا مجموعہ ہے، مگر اساسی طور پر اس میں چار بڑی چیزیں ہیں، جن کی ترتیب یہ ہے: جسم، رُوح، عقل اور عشق، اور ان کی غذائیں بھی مختلف اور الگ الگ ہیں، چنانچہ جسم کی خوراک جسمانی اور مادّی ہے، رُوح کی غذا رُوحانی یعنی ذکر و عبادت سے حاصل ہے، عقل کی خوراک عقلی یعنی علم و حکمت سے ہے، عشق کی غذا نُورِ ہدایت کے عشق و محبّت سے حاصل ہوتی ہے۔

یہ ایک روشن دلیل ہے کہ جُملہ انبیاؑ علیھم السّلام کی راہِ رُوحانیت

اور طریقِ حقیقت ایک ہی ہے اور وہ صراطِ مستقیم ہے، اور اُن حضرات پر جو جو رُوحانی عجائب و غرائب اور معجزات گزر گئے ہیں، وہ ان کی ہدایت اور مثالی پیروی سے پوشیدہ اور ہٹ کر نہیں ہو سکتے، اس کا مطلب یہ ہُوا کہ حضرت محمّد مُصطفٰے صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم اور حضورؐ کے برحق جانشینوں کی کامل اور حقیقی پیروی میں ہر درجہ کی معرفت کا حصُول ہو سکتا ہے اور اسی طرح انبیائے قرآن کے تمام رُوحانی معجزات کا مشاہدہ ممکن ہے، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو خُداوندِ مہربان تمام اہلِ ایمان کو قرآنِ حکیم میں ایک ایسی شاندار اور پُرمغز دُعا کی تعلیم نہ دیتا جس کا مفہوم و منشاء یہ ہے کہ مومنین کو راہِ رُوحانیت میں نہ صرف پیغمبروں کے نقشِ قدم پر چلنا ہے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اُن پر عطا کی گئی نعمتوں کا مشاہدہ کر کے خُدا کی وسیع تر رحمت کا یقین بھی کر لینا ہے، اور وہ بابرکت دُعا یہ ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (۱/۵-۶)

آپ شاید باور کریں گے کہ حضرت داؤد پیغمبرؑ ظاہر کی نسبت باطن میں کہیں زیادہ خوش الحان تھے، آپ نہ صرف جسمانی زبان سے پروردگار کی حمد و ثنا کے گیت گایا کرتے تھے، بلکہ اپنی رُوح کی انتہائی شیریں اور سُریلی آواز میں بھی لاھوتی ترانے الاپتے تھے، جیسا کہ باری تعالٰی کا یہ ارشاد ہے:-

اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو تابع کر دیا کہ وہ داؤدؑ

کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور ہم ہی میں ایسا کرنے کی قدرت ہے (۲۱/۷۹) پہاڑوں کی تاویل ہے بڑی بڑی رُوحیں، اور پرندوں سے عام رُوحیں مراد ہیں، چنانچہ قیامت خیز معجزاتی بانسری بجنے پر بڑی اور چھوٹی ارواح سب کی سب لطیف ذرّات کی شکل میں حضرت داؤدؑ میں جمع ہو گئیں، اور پھر زبانِ قدسی سے نغمۂ داؤدی کی ہمنوائی کرتی رہیں، جس کے ساتھ جبرائیلؑ، میکائیلؑ اور عزرائیلؑ بھی ہم آہنگ ہو جاتے تھے، اور ناقور کی مبارک آواز برسوں تک جاری رہتی ہے، مگر عام نیند سے اس میں خلل پڑتا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السّلام ناقور کے بہشتی نعمات اور عشقِ الٰہی سے محو ہو جاتے تھے، تو انہیں ایک طرف سے یہ احساس ہو جاتا تھا کہ پُوری کائنات اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ ان کی ذات میں سمٹ کر محُدود ہو گئی ہے، اور دُوسری طرف سے یُوں معلوم ہوتا تھا کہ آپؑ ناقور کی ہم آہنگی میں ارض و سما میں پھیل رہے ہیں، اور یہ دونوں باتیں حقیقت ہیں، کیونکہ کائنات کی رُوحانی تسخیر اسی طرح ہُوا کرتی ہے، جیسا کہ فرمانِ خُداوندی ہے :۔

کیا تمُ لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو کچُھ آسمانوں میں ہے اور جو کچُھ زمین میں ہے (غرض سب کچُھ) خُدا ہی نے یقیناً تمہارا تابع کر دیا ہے اور تمُ پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پُوری کر دیں (۳۱/۲۰)، اِس مبارک ارشاد کی وضاحت یُوں ہے کہ پروردگارِ عالم نے ہر

پیغمبر اور ہر امام کی ذاتِ بابرکات میں رُوحانی طور پر آسمان و زمین کی تمام چیزوں کو جمع کر رکھا ہے، اور یہ تسخیرِ کائنات ہے، تاکہ ہر شخص ہادیٔ زمانؑ کی حقیقی فرمانبرداری سے اِس دولتِ لازوال کو حاصل کر سکے، ورنہ خُدا تعالیٰ کے اِس احسان جتانے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔

افسوس ہے کہ بعض لوگ عملی معرفت تو درکنار اس کے لفظی معنی کو بھی نہیں سمجھ سکتے ہیں، ورنہ وہ بہت کچھ باور کر سکتے، کہ معرفت شناخت ہے ربِّ عزّت کی، اور اُس کی بادشاہی کی ہر چیز کی، اِس پر کوئی شخص یہ سوال ضرور کرے گا کہ: یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ خُدا اور جُملہ خُدائی کی معرفت پر علمی احاطہ کر لیا جائے؟ اِس کا جواب مشکل نہیں، بڑا سادہ ہے کہ یہ عظیمُ الشان کام خود خُدا ہی کی رحمت سے انجام پا سکتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ: اَلْمُؤْمِنُ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ۔ اِس کی وضاحت ہے کہ مومن خُدا کو اور اس کی بادشاہی کی ہر چیز کو نورِ الٰہی کی آنکھ سے دیکھ کر پہچان لیتا ہے۔

یہ نکتہ ہمیشہ کے لئے یاد رکھو کہ دُنیا کی بادشاہی پراگندہ (منتشر) ہُوا کرتی ہے، مگر خُدا کی پاک خُدائی اِس کے برعکس یگانہ ہوتی ہے، یعنی وہاں تو صرف اور صرف ایک اکیلی حقیقت ہے، جس میں تمام حقیقتوں کی یکجائی اور وحدت ہے، بس اسی "یک حقیقت" کی معرفت (پہچان)، کُلّ معرفتوں کا سرچشمہ ہے۔

مذکورۂ بالا اصلِ اصُول کی روشنی میں آپ یقین کر سکیں گے، کہ قرآنِ کریم میں جن جن حقائق و معارف کا الگ الگ ذکر فرمایا گیا ہے، وہ سب رُوحانیت کے مرکزِ اعلیٰ پر یکجا اور جمع ہیں، چُنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جو صفت ایک پیغمبر میں نمایاں نظر آتی تھی، وہ دُوسرے سب انبیاءؑ میں پوشیدہ تھی، لہٰذا کسی کو ہرگز یہ خیال نہ ہو کہ اسرافیلؑ کے لاہوتی نغمات صرف جناب داؤدؑ سن لیا کرتے تھے، فرشتوں نے صرف حضرت آدمؑ کو سجدہ کیا، اور اللہ نے صرف حضرت مُوسیٰؑ سے کلام فرمایا، آپ اس میں اچھی طرح سے سوچ سکتے ہیں، کہ حقیقتِ حال کیا ہے۔

بہشت کئی درجات پر مبنی ہے، جس کی اصل و اساس جُثّۂ ابداعیہ ہے، سو جنّت کی لاتعداد نعمتیں چار قسموں میں ہیں، یعنی جسمِ لطیف کے لئے لطیف جسمانی نعمتیں، رُوح کے لئے ہر قسم کی رُوحانی نعمتیں، عقل کے لئے عقل و دانش اور علم و عرفان کی بیشمار نعمتیں، اور عشق کیلئے ربّ العزّت کی مُبارک لِقاء اور اس کی پاک محبّت و عشق کی نعمتیں، چُنانچہ بہشت میں خُداوندِ برحق کی تحمید و تمجید کے نغموں کا ہونا لازمی ہے، اور یہ نغمے ہزار گونہ تجلّیات و ظہورات کے مطابق بھی ہوں گے۔

عُلمائے ظاہر میں سے بعض حضرات بہشت کے نغمات کی دلیل اس آیۂ کریمہ سے لیتے ہیں: اُدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ اَنۡتُمۡ وَ اَزۡوَاجُكُمۡ تُحۡبَرُوۡنَ (۴۳/۷۰) تم اور تمہارے جوڑے جنّت میں داخل ہو جاؤ جہاں تمہیں نغمے سُنائے جائیں گے۔ اُن عُلماء کا یہ ترجمہ بالکل دُرست

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

ہے، اس کے علاوہ اور بھی آیاتِ مُبارکہ ہیں، جن کے اندر یہ مطلب پوشیدہ ہے، مثال کے طور پر آپ اِس ارشادِ قرآنی میں ذرا غور کریں :-

وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ (۴۳/۷۱)

اور وہاں جس چیز کو جی چاہے اور جس سے آنکھیں لذّت اُٹھائیں (سب) موجُود ہیں۔ حقیقت ظاہر ہے کہ جنّت میں ہر وہ چیز موجُود ہے جس کو انسان چاہتا ہے، پس اِسی سلسلے میں موسیقی اور راگ بھی ہوگا، کیونکہ نفوسِ انسانی ایسی چیزوں کو بھی چاہتے ہیں۔

رُوحانیّت اور موسیقی کی اِس بحث میں جہاں سیّدنا داؤدؑ کا ذکرِ جمیل آیا ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ آپؑ کی آسمانی کتاب زبُور سے بھی کوئی مثال پیش کی جائے، چُنانچہ زبُور کے آخری باب کی چند آیتیں یہ ہیں: نرسنگے کی آواز کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ بربط اور ستار پر اس کی حمد کرو۔ دف بجاتے اور ناچتے ہوئے اس کی حمد کرو۔ تار دار سازوں اور بانسلی کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ زور سے جھنجھناتی جھانجھ کے ساتھ اس کی حمد کرو (زبور۔ باب ۱۵۰)

اَب آخر میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبرِ آخر زمان صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم موسیقی اور راگ کو کس نظر سے دیکھتے تھے؟ اِس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اس میں حضورِ اکرمؐ کی پسند و ناپسند منشاءِ قرآن کے مطابق ہی ہو سکتی ہے، تاہم اگر کسی عزیز کو اس مسئلہ کی تفصیلات درکار ہوں، تو کتاب "اِسلام اور

موسیقی" کا مطالعہ کیا جائے، جو مولانا شاہ محمدؐ جعفر پھلواردی کی ایک عمدہ تصنیف ہے، جسے "ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور" نے شائع کیا ہے۔

مذکورہ کتاب (طبعِ دوم) کے صفحہ ۸۰ پر یوں درج ہے: "اور یہ روایت سب ہی جانتے ہیں کہ ہجرتِ مدینہ کے دن عورتیں دف پر یہ گا رہی تھیں:۔

طلع البدر علینا — مِن ثنیات الوداع

ہم پر چاند نکلا ہے — وداع کے ٹیلوں سے

وجب الشّکر علینا — ما دعا لِلّٰہِ داع

ہم پر شکر واجب ہے — جبتک کہ دُعا کرنیوالا دُعا کرتا رہے

ایھا المبعوث فینا — جِئتَ بالامر المُطاع

اے وہ جو ہمارے اندر بھیجے گئے ہیں — آپ تو وہ دین لائے ہیں جو واجب الاطاعت ہے"۔

میرے خیال میں یہاں تک جو حقائق و معارف بیان ہوئے، یہ ان دونوں سوالوں پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں، جو اس مقالہ کے شروع میں درج ہیں، اور خُلاصہ یہ ہے کہ انسانی رُوح یہاں نقشِ ازل میں ایک زندہ نُورانیّت رکھتی ہے، وہاں پر یہ بدرجۂ اعلیٰ لطیف اور ہر گونہ جمال و کمال کی دولت سے مالامال ہے، لیکن یہاں اس کی وابستگی جسمِ کثیف سے ہے، وہاں یہ اپنی تمام تر خُوبیاں اور لطافتیں کھو بیٹھی ہے، اور اس کی وجہ قدآتی

اشارات کے مطابق قساوتِ قلبی (دل کی سختی) ہے، جو اخلاقی اور رُوحانی ترقی کے لئے بنیادی رکاوٹ ہے، اور اس کا علاج ایسی موسیقی اور نغمے میں ہے جو خُدا تعالیٰ اور آخرت کی طرف توجّہ دلا سکے، تاکہ اس کے نتیجے میں دل میں رحمتِ خُداوندی کا معجزہ اپنا کام شروع کرے، اور وہاں جو رُوح کے مُردہ، نیم مُردہ اور خوابیدہ ذرّات ہیں، وہ اس اسرافیلی اور داؤدی اثر سے جاگ اُٹھیں۔

اِس سے صاف صاف ظاہر ہے کہ انسانی رُوح پر موسیقی کا تعمیری اثر پڑتا ہے، اور اس کی مثال نہ صرف ظاہر میں بلکہ اعلیٰ رُوحانیت میں بھی سُورج کی طرح ہے، کہ آفتاب اپنی حرارت سے پانی کو کثیف سے لطیف بنا دیتا ہے، جس کی بدولت پانی بلندیوں کی طرف پرواز کر سکتا ہے، یہاں نُورِ عشق سُورج ہے اور رُوح یخ بستہ پانی۔ وَبِاللّٰہ التوفیق۔

خانۂ حکمت۔ کراچی

۲۰؍ نومبر ۱۹۸۲ء

مذہب اور سائنس ۱

کراماً کاتبین

مجھے کامل یقین ہے کہ "مذہب اور سائنس" کا موضوع عصرِ حاضر میں از بس ضروری ہے، اِس لئے مَیں پُر امیّد ہوں کہ عنوانِ بالا کے تحت یہاں جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ ہمارے قارئینِ کرام کو مفید ثابت ہو سکتا ہے، کیونکہ سائنس جو قانونِ فطرت کے بھیدوں میں سے ہے اسے کوئی دانشمند دیندار نظر انداز نہیں کر سکتا ہے، بلکہ حقیقت میں ہمیشہ اِس بات کی ضرورت رہی ہے کہ مذہب کو سائنس کی روشنی میں دیکھا اور سمجھ لیا جائے، تاکہ اِسلام جو دینِ فطرت ہے اِس کے باطنی پہلو کو سمجھنے میں مدد ملے۔

مذہب اور سائنس کے متعلق بہت سے موضوعات زیرِ بحث آسکتے ہیں، آج ہم یہاں اِس سلسلے میں "کراماً کاتبین" کے عنوان سے کچھ حقائق و معارف بیان کرنا چاہتے ہیں، جن کے بارے

میں قرآنِ پاک کا ارشاد ہے کہ :-

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۔ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۔ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (۸۲/۱۰-۱۲) اور تم پر (تمہارے سب اعمال) یاد کرنے والے معزز لکھنے والے (فرشتے) مقرر ہیں جو تمہارے سب اعمال کو جانتے ہیں۔

یہ اصول ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یاد رہے کہ آسمانی کتاب کے ظاہری معنی اُس زمانے کے مطابق ہوتے ہیں جس میں کہ کتاب نازل ہوئی تھی، مگر اس کی باطنی حکمت (تاویل) آنے والے تمام زمانوں پر محیط ہوتی ہے، تاکہ مستقبل کی نئی نسلیں جدید علوم وفنون کی روشنی میں دین کی حقیقتوں کو سمجھ سکیں، چنانچہ جو معزز فرشتے انسانی اعمال کے لئے حافظین اور کاتبین کا کام کرتے ہیں، ان کی وضاحت موجودہ سائنسی روشنی میں درست ہے، کہ یہ فرشتے معزز اِس معنیٰ میں ہیں کہ ان کو قادرِ مطلق نے زبردست روحانی طاقتیں عطا کردی ہیں، اِس لئے وہ ہمارے اعمال کے زندہ ریکارڈر ہیں، یعنی وہ ہماری پوری زندگی کی روحانی فلم اُتارتے رہتے ہیں جس میں اعمالِ نیک وبد کا ذرّہ ذرّہ سامنے آتا ہے اور کوئی چیز اِس سے باہر نہیں رہ سکتی، یہ سب کچھ ان فرشتوں کے تحت آٹومیٹک سسٹم سے ہوتا رہتا ہے، اور یہ عظیم باکرامت فرشتے جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل علیہم السّلام ہیں، جن کے زیرِ فرمان اتنے زیادہ فرشتے اور ارواح کام میں مصروف

ہیں کہ ان کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

انہی ریکارڈ کرنے والے فرشتوں کو رُسُل یعنی ایلچی یا بھیجے ہوئے بھی کہا گیا ہے (۱/۲۱ ، ۴۳/۸۰) کیونکہ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل علیہم السّلام فرشتوں میں سے رسُول ہیں، جبکہ خُداوند تعالیٰ فرشتوں سے اور انسانوں سے رُسُل منتخب کرتا ہے (۲۲/۷۵) کیونکہ انسان کی ہستی کے دو پہلو ہیں ایک ظاہر ہے اور دُوسرا باطن؛ بنابریں آدمی ناسوت اور ملکوت کے درمیان رہتا ہے اور یہی سبب ہے کہ خُدا نے ناسوت سے بھی اور ملکوت سے بھی رسُول مقرّر کئے ہیں۔

پروردگارِ عالم نے کِراماً کاتبین کے کام کو اپنی ذاتِ پاک سے منسُوب کرکے فرمایا ہے: سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا (ہم ان کے کہے ہُوئے کو لکھ رہے ہیں ۳/۱۸۱) كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ (ہرگز نہیں، ہم اس کا کہا ہُوا لکھ لیتے ہیں ۱۹/۷۹) وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ (اور ہم لکھتے جاتے ہیں وہ اعمال بھی جن کو لوگ آگے بھیجتے جاتے ہیں اور ان کے وہ اعمال بھی جن کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں ۳۶/۱۲) اِس سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ جو کام یہ عظیم فرشتے کرتے ہیں وہ گویا خُدا بذاتِ خود کرتا ہے۔

کِراماً کاتبین کی نگرانی میں جو کچھ خود بخود ریکارڈ ہوتا رہتا ہے اِس کا نام اعمال نامہ ہے جو ایک زندہ اور بولنے والی کتاب ہے،

جس سے اِنسان کی تمام زندگی کی رُوحانی فلم مُراد ہے، کیونکہ نامۂ اعمال وہ ہے جس میں مکمّل گواہی کے طور پر ہر چیز جیسی تھی ویسی درج ہوتی ہے، یعنی اِنسان اور اس کے قول و فعل کی زندہ اور متحرّک تصویر ساتھ ہی ساتھ زمان و مکان اور پُورے ماحول کا رُوحانی عکس موجُود ہوتا ہے، جس کو زمانے کی زبان میں رُوحانی فلم کہنا مناسب ہے، جیسا کہ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے :-

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ (۳۶/۱۲) بیشک ہم مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ہم لکھتے جاتے ہیں وہ اعمال بھی جن کو لوگ آگے بھیجتے جاتے ہیں اور ان کے وہ اعمال بھی جن کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور ہم نے ہر چیز کو امامِ مُبین (کے نُور) میں گھیر کر رکھا ہے۔ یہاں اعمال نامہ کے باب میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اس میں نہ صرف وہ اعمال و احوال درج ہوتے ہیں جو مرنے سے پہلے آگے بھیجے گئے ہیں بلکہ اس میں وہ آثار بھی ضبط ہیں جو دُنیا میں چھوڑ جاتے ہیں اور یہ سب کچھ امامِ مُبین کے نُور میں محدُود اور موجُود ہے۔ اس سے کئی حکمتیں واضح ہو جاتی ہیں، ایک تو یہ کہ آئینۂ اعمال (یعنی اعمال نامہ) میں دو قسم کے احوال نظر آئیں گے، وہ اعمال بھی جو مرنے سے پہلے انجام دیئے گئے تھے، اور وہ آثار بھی جو دُنیا میں چھوڑ گئے ہیں، دُوسری حکمت یہ ہے کہ

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

کراماً کاتبین نورِ امامت کی کرنوں کی حیثیت سے ہیں، یہی وجہ ہے جو یہاں فرمایا گیا ہے کہ انسانوں کے اعمال و آثار اور ہر چیز امامِ مُبین کے نُور میں مندرج ہوتی ہے، تیسری حکمت یہ ہے کہ اعمال نامہ، بولنے والی کتاب اور امامِ مُبین ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں اور وہ حقیقت امامِ زمان ہی ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ: وَلَدَيۡنَا كِتَٰبٞ يَنطِقُ بِٱلۡحَقِّ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُونَ (۲۳/۶۲) اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو سچ سچ بولتی ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ یہ بولنے والی کتاب جو خُدا کے پاس ہے نورِ امامت ہے جو انسانوں کے لئے نامۂ اعمال کی حیثیت بھی رکھتا ہے، وہ عزّت و برتری کے معنی میں خُدا کے پاس ہے مگر لوگوں کی ہدایت کے لئے دُنیا میں ظاہر ہے تاکہ عدلِ خُداوندی کا جو قانُون ہے اُس کا تقاضا پُورا ہو، ورنہ یہ بات رحمتِ ایزدی سے بعید ہے کہ بولنے والی کتاب صرف خُدا ہی کے پاس رہے اور وہ فقط قیامت کے دن انسان پر ظاہر اس لئے ہو جائے تاکہ شہادت اور حساب میں کوئی شئے فروگذاشت نہ ہو، یہ تصوّر دُرست نہیں، کیونکہ مذکورۂ بالا آیت میں "لا یُظلمون" فرما کر اس حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے کہ بولنے والی کتاب نہ صرف قیامت میں ظاہر ہوگی بلکہ وہ دُنیا میں بھی موجُود ہے، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو (نعوذ باللہ) خُدا کی طرف سے لوگوں پر ظلم ہوتا۔

اعمال نامہ جسے عظیم فرشتے ریکارڈ کرتے ہیں، جس کو

نورِ امامت سے رُوح ملتی ہے، وہ ذرّاتِ رُوح پر مشتمل ہے، چنانچہ انفرادی قیامت یا رُوحانیت میں مشاہدہ کیا گیا ہے کہ یہ اعمال نامہ اُڑتے ہوئے رُوحانی ذرّات کی تشکل میں آتا ہے، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے :-

اور ہم نے ہر انسان کا اعمال نامہ اس کے گلے میں لگا رکھا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کے لئے نکال دیں گے جو اس کو بکھری ہوئی کتاب کی شکل میں ملے گا (۱۳:۱۷) یعنی ہر شخص کا اعمال نامہ اس کے امام سے وابستہ ہے جو رُوحانی گردن کی حیثیت رکھتا ہے اور قیامت کے دن یہ اعمال نامہ منتشر رُوحانی ذرّات پر مبنی ملے گا، اس بارے میں عوام کا خیال ہے کہ اعمال نامہ دُنیا کی ایک کتاب کی طرح ہے اور وہ ورق ورق ہو کر انسان کے پاس آئے گا، حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے، اور درست یہ ہے کہ وہ ذرّاتِ رُوح پر مبنی ہے، لہٰذا وہ (اعمال نامہ) بولتا ہے۔

جو بندۂ مومن جسمانی طور پر مرنے سے پہلے نفسانی طور پر مر کر احوالِ قیامت کا مشاہدہ کرتا ہے، وہ اِس حقیقت پر یقین کرتا ہے کہ ذاتی رُوحانیت ہی اس کا اعمال نامہ ہے، کیونکہ اعمال کی کتاب کا مقصد اچھے اور بُرے کاموں کے نتائج کو سامنے رکھنا ہے اور رُوحانی مشاہدے یا رُوحانیت کا مطلب باطنی صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھا کر نتائجِ اعمال کے متعلق مطمئن ہو جانا ہے۔

ہم اس سے قبل یہ بیان کر چکے ہیں کہ بزرگ فرشتوں کا نامۂ اعمال

تیار کرنا دُنیاوی قلم سے نہیں ہے بلکہ وہ رُوحانی قوتوں کے ذریعہ ہے، جس کو ہم آجکل کی سائنسی ترقی سے فائدہ اُٹھا کر فلمانے سے تشبیہ دے سکتے ہیں، جس طرح ہم سوتے سوتے خواب کی دُنیا کو دیکھتے ہیں، جس میں اچھے اور بُرے بہت سے احوال ہوتے ہیں، جو اعمال نامہ اور رُوحانیت کے ادنیٰ سے نمونے ہوتے ہیں، خواب اور خیال کو ہم فرشتوں کی تحریر تو کہہ سکتے ہیں، مگر یہ مادّی قلم کی تحریر نہیں ہے۔

خواب وخیال ہو یا نامۂ اعمال و رُوحانیت اس میں اقوال وافعال کو جبرائیل فرشتہ شکل وصُورت دیتا ہے، میکائیل رنگ و روشنی بھرتا ہے، اسرافیل ان رُوحانی تصویروں میں رُوح ناطقہ ڈالتا ہے اور عزرائیل ان میں تصرّف کرتا ہے، یہ ہُوا کراماً کاتبین کا نامۂ اعمال کو لکھنا اور یہی ہے رُوحانیت کی تحریر۔

یہی رُوحانی تحریر خدائی تحریر ہے، جس میں آسمانی کتاب نازل ہوتی ہے اور تاویلی حکمت بھی اِسی صُورت میں پوشیدہ رہتی ہے چنانچہ مومنین کے لئے یہ امر ممکن ہے کہ پیغمبرؐ کی تنزیل اور امام کی تاویل کا رُوحانی مُشاہدہ کر کے ان کے مرتبۂ عالی کی معرفت حاصل کریں۔

جاننے کی ضرورت ہے کہ کراماً کاتبین اعمال کے فرشتے ہونے کے علاوہ رحمت کے فرشتے بھی ہیں، وہ یہ کہ عزرائیل انسان کو سُلاتا ہے، اسرافیل جگاتا ہے، میکائیل فہم وفراست دیتا ہے

اور جبرائیل فکر و خیال کو پیدا کرتا ہے۔ پس "کراماً" کے معنی میں یہ فرشتے معزّز بھی ہیں اور کرم والے بھی ہیں۔

فقط آپ کا

علمی خادم

نصیر الدّین نصیر ہونزائی

۱۵ / اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ء

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

روح — ایک انتہائی پیاری حقیقت

قرآنِ پاک اور دینِ اسلام کا مقصدِ عالی یہ ہے کہ مُسلمین و مومنین پیغمبرِ خُداؐ اور امامِ برحق ؑ کی تعلیمات وہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ میں چشمِ بصیرت پیدا کریں، تاکہ وہ بطریقِ مُشاہدۂ رُوح ورُوحانیت ربّ العزّت کی معرفت حاصل کر سکیں، اور ان کا ہر قول وعمل دیدہ و دانستہ طور پر انجام پائے، کیونکہ انسان کو حیوان پر تفوّق وبرتری اِس لئے حاصل ہے کہ یہ ہر بات اور ہر کام عقل و دانش کی روشنی میں کرتا ہے، مگر حیوان اس سے محروم ہے۔

چشمِ بصیرت، دیدۂ دل اور چشمِ باطن کا مطلب ایک ہی ہے، اور اس کی اہمیّت وضرورت کے بارے میں قرآنِ عزیز کا یہ ارشاد ہے: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲: ۱۰۸) (اے رسولؐ) اُن سے کہدو کہ میرا طریقہ تو یہ ہے کہ میں (لوگوں) کو خُدا کی طرف بُلاتا ہُوں میں اور میرا پیرو (یعنی برحق جانشین) بصیرت پر ہیں یعنی ہم

ISW Institute for Spiritual Wisdom Luminous Science Knowledge for a united humanity

حقائق و معارف کو چشمِ باطن سے دیکھتے ہُوئے دعوت کرتے ہیں ، اس آیۂ کریمہ میں " مَن " کی ضمیر واحد کے لئے بھی ہے اور جمع کے لئے بھی ، سو جہاں واحد ہے وہاں یہ مولا علیؑ کے لئے ہے اور جس طرح جمع بھی ہے اُسی طرح یہ ائمّہؑ ، اولادِ علیؑ کے لئے بھی ہے کہ رسُولِ پاکؐ کی حقیقی پیروی کا وسیلہ یہی حضرات ہیں اور بصیرت و نُور بھی اسی سلسلۂ مقدّس سے وابستہ ہے ۔

ہر مُسلمان اور ہر مومن میں چشمِ بصیرت کا پیدا ہو جانا انتہائی ضروری ہے ، کیونکہ خُداوندِ عالم اپنی کتابِ عزیز کے بہت سے ارشادات میں یہ چاہتا ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ آیاتِ قدُرت کا مطالعہ کرے ، ایسے تمام مقامات پر سب سے اوّل دیدۂ دل کی اہمیّت و افادیت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ آیاتِ قدُرت میں غور و فکر کا بُنیادی تعلق چشمِ بصیرت سے ہے ، اور اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ۔

آیاتِ خُداوندی (قدُرت کی نشانیاں) تین مختلف مقامات پر ہونے کے باوجُود باہم مربُوط و منظّم ہیں ، سب سے پہلے اور سب سے اعلیٰ کتابِ سماوی یعنی قرآن کریم ہے جو اللہ تعالیٰ کی بے مثال کتاب ہے ، جس کی قدُرتی تشریح ایک تو کائنات ہے اور دُوسری رُوح ، اور رُوح سے انسان کی پاک اور حقیقی رُوح مراد ہے ۔

قرآنی غور و فکر اور چشمِ بصیرت کی جیسی اہمیّت ہے ، اِس

سے کوئی دانشمند انکار نہیں کرسکتا، لہٰذا اس کے ثبوت میں منجملہ ایک آیۂ کریمہ کا ترجمہ یہ ہے: تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا (ان کے) دلوں پر تالے (لگے ہوتے) ہیں (۴۷/۲۴)

کائنات میں جو قرآن کی تشریحی آیات ہیں، اُن کے مطالعے کے لئے بصیرت کی جیسی ضرورت ہے، وہ اِس قرآنی ہدایت سے ظاہر ہے: یقیناً رات دن کے اُلٹ پھیر میں اور جو کچھ خدا نے آسمانوں اور زمین میں بنایا ہے (اس میں) پرہیزگاروں کے واسطے بہت سی آیات (نشانیاں) ہیں (۱۰/۶)

اِنسان کی رُوح و رُوحانیت میں جس طرح آیاتِ قدرت یعنی عجائب و غرائب یا کہ عظیم معجزات ہیں، ان کے مشاہدے کے لئے دیدۂ دِل کی جس قدر ضرورت ہے، اس کی بابت فرمانِ الٰہی کا ترجمہ یہ ہے: اور اہلِ یقین کے لئے زمین میں (قدرتِ خُدا کی) بہت سی نِشانیاں ہیں اور خود تُم میں بھی ہیں تو تُم کیا دیکھتے نہیں (۵۱/۲۰-۲۱)۔

مندرجہ بالا حقائق سے اِنسانی غور و فکر اور بصیرت کی بڑی حد تک کمی اور دُوسری طرف دائرۂ فرائض کی بے پناہ وسعتوں کا اندازہ ہو جاتا ہے، اِس لئے ظاہری طور پر انسان کی کمزوری اور سستی کی یُوں ترجمانی ہو سکتی ہے: "اِنسان ضعیف البُنیان کی کیا مجال ہے کہ وہ بیک وقت تین سمندروں میں کود کر موتیوں

کے لئے غواصی کرے، یعنی ایک ہی وقت میں قرآن جیسے علم و حکمت کے بحرِ عمیق کی گہرائیوں میں بھی اُتر جاتے، ساتھ ہی ساتھ کائنات و موجودات کی چیزوں میں بھی فکر دوڑاتے، اور اُسی وقت اپنی رُوح یا ذات کے اسرار کی نقاب کُشائی بھی کرے، اور اگر یہ لاانتہا کام اُسے باری باری اور جُدا جُدا اوقات میں کرنا ہے، تو پھر بھی اس کی ایک عمر کیا چیز ہو سکتی ہے ہزاروں عمریں بھی ناکافی ہیں"۔ لیکن کسی آدمی کا یہ خیال بالکل غلط ہے، کیونکہ خُدا جو رحمان و رحیم ہے، وہ کسی بھی ناممکن کام کا حکم ہرگز نہیں دیتا، جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے: لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶) خُدا کسی کو (کسی فریضہ میں) اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

اِس مختصر اور پُر حکمت آیۂ کریمہ سے صاف ظاہر ہے کہ خُدائے مہربان نے اِنسان کے لئے جن جن فرائض کی انجام دہی کا لائحۂ عمل بنا رکھا ہے، ان میں کوئی چیز کسی طرح سے بھی غیر ممکن نہیں، چنانچہ اہلِ دانش کے نزدیک یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ اِنسان کے دائرۂ اختیار اور احاطۂ فرائض میں جو کچھ داخل ہے، وہ نہ تو ناممکن ہے اور نہ ہی مُشکل، کیونکہ یہ بات خُدا تعالیٰ کے علم سے ہرگز ہرگز پوشیدہ نہیں کہ انسان بہت ہی کمزور و ناتوان ہے، اور خُدا نے خود ہی برِبنائے مصلحت و حکمت اِنسان کو ضعیف (کمزور) بنایا ہے، جیسا کہ قرآن (۴/۲۸) میں ہے، اور یہی

وجہ ہے کہ پروردگارِ عالم نے رُوئے زمین پر ہمیشہ کے لئے اپنے مقدّس نور کا وسیلہ مقرر فرمایا ہے، تاکہ ہر شخص نورِ الٰہی کی طرف رجوع کر کے اپنی کمزوری کا مداوا کرے۔

اب رہا سوال یہ کہ آیا علم و حکمت یعنی آیاتِ قدرت کے تین سمندر قطعاً الگ الگ ہیں، جیساکہ یہ بظاہر جُدا جُدا ہیں، یا ان کا کوئی مرکز اور سنگم بھی ہے؟ اِس کا جواب یُوں دیا جائے گا کہ یقیناً ان کا مرکز اور سنگم ہے، اور وہ اِنسان کی پاکیزہ رُوح میں پوشیدہ ہے، اور حقیقت میں یہ سنگم وہی ہے، جہاں پر حضرت مُوسیٰؑ نے سفرِ رُوحانیت میں خضرِ زمانؑ سے مُلاقات کی تھی، جو تنزیل و تاویل اور ظاہر و باطن کے اعتبار سے مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ (۱۸: ۶۰ دونوں دریاؤں کا سنگم) کہلاتا ہے، جو علمِ لَدُنّی کا مقام ہے۔

اِس حقیقت کے ثبُوت میں کہ اِنسان کی ذات میں مذکورہ سمندروں کا سنگم پوشیدہ ہے زیادہ کچھ کہنے کی بجائے صرف مولا علیؑ کے ایک ارشاد کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے: "کیا تو گمان کرتا ہے کہ تُو ایک چھوٹا سا جسم ہے؛ حالانکہ تجھ میں عالمِ اکبر (معہ اپنی تمام چیزوں کے) سما گیا ہے"۔ اِس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اِنسان کی رُوح اور رُوحانیت میں ساری کائنات کی حقیقتیں جمع کی گئی ہیں، اور یہ رُوح اپنے درجۂ کمال پر کتابِ مُبین (بولنے والی کتاب) ہے۔

بلاشُبہ ہر شخص خواہ مومن ہو یا کافر بحدِّ قوّت کتابِ مُبین ضرور

ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے حضور سے جو نور اور کتابِ مُبین (قرآن) آئی ہے (۵/۱۵) اس میں ہر آدمی کا فنا ہو جانا شرطِ لازمی ہے، تاکہ ایسا خوش نصیب شخص حدِّ قوت سے حدِّ فعل میں آکر کتابِ ناطق بن سکے، یاد رہے کہ فنا کی کئی قسمیں ہیں، اور مومن کو جس فنا کی ضرورت ہے وہ مکمّل فرمانبرداری کی صورت میں ہے، یعنی ایسی فرمانبرداری جو عقیدت، محبّت اور علم کی روشنی میں بجا لائی جاتی ہے۔

اِس بیان سے آپ کو بخوبی اندازہ ہُوا ہوگا کہ رُوح کے موضوع پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے، کیونکہ رُوح میں جُملہ حقیقتوں اور معرفتوں کے انمول خزانے رکھے ہوئے ہیں، ان خزائن میں خُدا کی خُدائی اور بادشاہی کے عظیم بھید پوشیدہ ہیں، اور ان میں یہ اسرار بھی ہیں کہ انسان کا خُدا سے حقیقی رشتہ کیا ہے، بندوں پر رحمان کی جیسی نوازشات ہیں، ان کی آخری حدّ کیا ہے، معرفت رُوح کی ہے یا ربّ کی، یا دونوں کی، اور کِس طرح، وغیرہ، پس رُوح کا موضوع سب سے اہم بھی ہے اور انتہائی پیارا بھی۔

رُوح کی ذات و اصل پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ آغاز میں بھی اور انجام میں بھی ایک ہی ہے، بلکہ یُوں کہنا چاہئے کہ اجسام، ارواح اور عقولِ جزُوی کی مجرّد حقیقتیں سرچشمۂ عقل میں ایک ہیں، کیونکہ کائنات و موجودات کی جُملہ اشیاء ایک ہی لُولُوئے مکنون (پوشیدہ موتی) سے پیدا کی گئی ہیں، یعنی گوہرِ عقل سے، جیسا کہ حکیم پیر ناصر خسرو قدس

فرماتے ہیں :-

چہ گوئی از چہ اُو عالم پدید آورد ؟ از لُؤلُؤ
کہ نہ مادت بدُ وصورت، نہ بالا بود و نہ پہنا

ترجمہ: تیرا کیا خیال ہے ؟ خُدا نے اِس کائنات کو کِس چیز سے پیدا کیا ؟ گوہر (عقل) سے، کہ وہ نہ تو مادّہ و صورت تھا، اور نہ ہی ابعادِ ثلاثہ (طول، عرض، عُمق)۔

اِس سے ظاہر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِس عالم اور اِس کی ہر ہر چیز کو گوہرِ عقل سے پیدا کیا، اور وہ گوہر زمان ومکان سے ماوَرا ہمیشہ اسی تخلیقی صلاحیت کے ساتھ موجُود ہے، کیونکہ یہ قلمِ قدُرت یا خامۂ تخلیق کا بلند ترین درجہ رکھتا ہے، لہٰذا مالکِ قلم (یعنی خدا) اِس سے ہمیشہ خلقت کو رقم کرتا رہتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے ایک پُر حکمت ارشاد ($\frac{6}{94}$) کا مفہوم یہ ہے: جب کوئی بندہ معبُودِ برحق کی طرف رجُوع کر جاتا ہے، تو وہ قانُونِ وحدانیت کے مطابق نہ صرف تنِ تنہا جاتا ہے، بلکہ اپنے جسم، رُوح

اور عقلِ جزوی کی ہر چیز کو بھی پیچھے چھوڑ کر جاتا ہے، اور شروع میں جیسا تھا ویسا مُنفرد و مجرّد ہو کر جاتا ہے، اِس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ وہ گوہر میں فنا ہو جاتا ہے، یعنی وہ اپنے آپ کو پہلے ہی سے وہاں موجُود پاتا ہے، اِس مقام کا ایک اور نام عِلّیّین ہے، جہاں حقیقی مومنین کی انائے عُلوی ایک زندہ کتاب یعنی نامۂ اعمال کی صُورت میں پہلے ہی سے موجُود ہوتی ہے (۸۳/۱۸)

نیز ارشاد فرمایا گیا ہے: اور قیامت کے دن ساری زمین اس کی مُٹھی میں ہوگی اور سارے آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپیٹے ہُوئے ہوں گے (۳۹/۶۷) اِس ربّانی تعلیم سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ جُملہ کائنات یعنی تمام چیزیں ایک ہی گوہر سے پیدا کی گئی ہیں اور آخرکار ہر چیز اسی گوہر میں فنا ہو جانے والی ہے، جیسا کہ فنا ہو جانے کا حق ہے، یاد رہے کہ کائنات کی چیزیں درجہ وار ہیں، اور اِس حقیقت کی مثال قرآنِ حکیم میں سیڑھیوں سے دی گئی ہے (۷۰/۳)، چنانچہ کوئی مخلوق خُدا تعالیٰ کی سیڑھیوں کے بغیر رجُوع کر کے مرتبۂ اعلیٰ میں فنا نہیں ہو سکتی ہے، لہٰذا وہ سیڑھی سیڑھی چڑھتی ہے اور اِنسانی صورت اختیار کر کے گوہرِ عقل میں جیسا کہ ذکر ہُوا فنا ہو جاتی ہے۔

ظاہری مخلوقات کے مدارج کی چار سیڑھیاں ہیں: جمادات، نباتات، حیوانات اور اِنسان، جو اِسی ترتیب سے ایک دوسرے

سے پیوستہ ہیں، یہ قانون بحیثیتِ مجموعی بالکل درُست ہے، تاہم اس سے چند مثالیں مستثنا بھی ہیں، جیسے جمادات سے نمک وغیرہ اور نباتات سے پھل جیسی چیزوں کا براہِ راست انسان تک پہنچ جانا۔

سوال عا : جب ہم ساگ پات اور پھل کو توڑ لیتے ہیں، اور جب حلال جانور کو ذبح کیا جاتا ہے، تو اُس وقت اُن سے رُوحِ نباتی اور رُوحِ حیوانی نکل ہی جاتی ہیں، پھر ہم ان میں سے جو کچھ کھاتے ہیں، اس میں کونسی رُوح ہوتی ہے؟ گوشت کے ایک ٹکڑے میں حیوانی رُوح ہے یا معدنی رُوح؟ سوال اس لئے ہے کہ اس میں اب نہ تو نباتی رُوح کی طرح نشو ونما (GROWTH) ہے، اور نہ ہی حیوانی رُوح کی طرح کوئی حس، سو ان چیزوں کے کھانے سے ہمارے اندر کون سی رُوح بنتی ہے؟

سوال عا۲ : رُوح کے مختلف درجات حقیقتاً کس طرح ایک ہیں؟ اس کی بھی کچھ وضاحت فرمائیں۔

مذکورہ دونوں دلچسپ اور مفید سوالوں کو ہمارے بعض خاص احباب نے اپنے ایک گرامی نامہ کے ضمن میں بھیجا ہے، اور اصل میں یہ مضمون جو آپ کے سامنے ہے انہی سوالوں کے متعلق لکھا گیا ہے، اب یہاں خداوندِ قدوس کی توفیق و یاری سے جواباً عرض کرتا ہوں:۔

جواب عا : عروج و ارتقاء کے لئے قانونِ فطرت یہ ہے کہ

ہر مخلوق اور ہر چیز اپنے اُوپر کے درجے میں پہنچنے کے لئے فنا ہو جاتی ہے، چُنانچہ نباتات اور حیوان بحکم خُدا قربان اور فنا ہو جاتے ہیں، تاکہ ان کی مُردہ حیثیت یعنی مواد سے ایک نئی عُمدہ زندگی بنائی جائے، جب حلال جانور کو ذبح کیا جاتا ہے تو یہ اس کی پہلی فنا ہے، اور جب گوشت پکایا جاتا ہے تو یہ اس کی دُوسری فنا ہو گئی، اب قدرتِ خُدا کو دیکھئے کہ یہی چیز جو فنا در فنا ہو چکی ہے، جب اُس کارخانۂ حیات میں داخل ہو جائے گی، جو انسان کے باطن میں پوشیدہ ہے، تو اس میں سے اوّل رُوحِ نباتی پیدا ہو گی، پھر رُوحِ حیوانی، اور پہلے سے بہت ہی عُمدہ حالت میں ہو گی، اس کے بعد رفتہ رفتہ نباتی رُوح حیوانی رُوح میں اور حیوانی رُوح اِنسانی رُوح میں فنا ہوتی رہے گی۔

پکا ہُوا گوشت کے ٹکڑے میں نہ تو حیوانی رُوح ہے اور نہ ہی نباتی رُوح، بلکہ وہ جمادات کی طرح ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس کی مثال میں دانشمندوں پر یہ حقیقت ظاہر کر دینا چاہتا ہے کہ وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے کِس طرح سے مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے، چنانچہ جب گوشت کا یہ مادّہ کارخانۂ جگر اور کارخانۂ دل میں اُتر جاتا ہے، تو اس میں سے رُوح نباتی اور رُوحِ حیوانی دوبارہ زندہ ہو جاتی ہیں، یہ واقعہ ایسا ہے جیسے اِنسان کا مر کر دوبارہ زندہ ہو جانا۔

جواب ۲: ازل اور ابد میں جُملہ ارواح ایک جیسی ہیں، جس کی مثال مادّی کائنات میں سُورج سے مل سکتی ہے کہ اِس کے

تمام ذرّات میں انفرادّیت، مساوات یکرنگی اور وحدت ہے، اور عالمِ دین میں اس کا نمونہ انبیاء علیہم السّلام ہیں کہ وہ حضرات نفسِ واحدہ کی طرح ایک ہیں، یہ سوچنے کا مقام ہے کہ قانونِ تفضیل[1] کے باوجود سب انبیاءؑ کیونکر ایک ہو سکتے ہیں، اور اگر عالم صرف دو ہی ہیں: ایک عالمِ کثرت اور دوسرا عالمِ وحدت، تو پھر حقیقت سمجھ میں آگئی کہ ایک کی دوسرے پر فضیلت اپنی جگہ پر درست ہے اور باہمی مساوات اور وحدت اپنے مقام پر صحیح ہے، چنانچہ اس دلیل سے ارواح کی مساوات اور ایک ہو جانے کی حقیقت روشن ہو گئی۔

تعصّب چھوٹے سے چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بڑے سے بڑا بھی، اور اگر کوئی شخص سب سے بڑے تعصّب سے خود کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے تو اسے اس آیۂ کریمہ میں غور کرنا چاہیئے: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (۲۳/۱۱۵) تو کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو (یوں ہی) بیکار پیدا کیا اور یہ کہ تم ہمارے حضور میں لوٹا کر نہ لائے جاؤ گے۔ اس میں بہشت اور دوزخ کے بعد کی حکمت بیان کی گئی ہے، کیونکہ اگر اہلِ جہنّم کا معاملہ

---

[1] اشارہ ہے اس آیۂ کریمہ کی طرف: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۲/۲۵۳) یہ سب رسول (جو) ہم نے (بھیجے) ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔

وہیں پر ختم ہو جاتا تو اُس صورت میں اُن کی تخلیق عبث (بیکار) ہو جاتی اور خُدا کے حضور میں سب کے جانے کا ذکر ہی نہ ہوتا، اِس سے ظاہر ہے کہ دوزخ کی سزا کے بعد بھی خُدا کی طرف رجُوع کرنا ہے۔

کوئی ہوشمند جو قرآن میں غور کرتا ہے اِس حقیقت سے انکار نہیں کر سکے گا کہ خیر بہشت کے اسماء میں سے ہے اور شر دوزخ کے ناموں میں سے (۳۲/۷)، چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ط وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ط وَإِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (۲۱/۳۵) ہر نفس (جان) موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور ہم تمہیں شرّ اور خیر میں امتحان کی غرض سے آزماتے ہیں اور (آخرکار) ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ دُنیا میں جزوی طور پر خیر و شر ہے اور آخرت میں کُلّی طور پر، چونکہ خیر و شر بہشت اور دوزخ ہیں اور ان کی وجہ سے لوگوں کی عملی آزمائش یہ ہے کہ جنّت میں علم و حکمت سے لوگوں کی پاکیزگی ہوتی ہے اور دوزخ میں لوگ جل جل کر بہشت کے قابل ہو جاتے ہیں، تاکہ وہ وہاں پاک و پاکیزہ ہو کر خُداوندِ عالم کے حضورِ مقدّس جانے کے لائق ہو سکیں۔

یاد رہے کہ بہشت میں دو قسم کے لوگ ہوں گے: تمام انبیاءؑ کی اُمتوں میں سے مومنین اور مومنات، اور حور و غلمان، یہ حور و غلمان کون سے لوگ ہیں؟ رُوحانی سلطنت کی کنیزیں اور غلام، جو

دوزخ (یعنی آتشِ جہالت) کی سزا کے بعد بہشت میں منتقل کئے گئے ہیں، تاکہ وہ یہاں علم و حکمت کے ذریعہ جہالت و نادانی سے پاک و پاکیزہ ہو جائیں، جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے :-

وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ (۳/۱۵) اور (بہشت میں پرہیزگاروں کے لئے) پاک کی ہوئی بیبیاں ہیں اور (سب سے بڑھ کر تو) خدا کی خوشنودی ہے۔ آپ ذرا سا غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ مُطَهَّرَةٌ ایک ایسا لفظ ہے جو مفعول ہونے کی وجہ سے اس پر تطہیر کا فعل واقع ہوا ہے، مراد یہ کہ جنّت کی بیبیاں پہلے پہل تو پاک نہیں تھیں، لیکن بعد میں وہ پاک کی گئی ہیں اور خدا کے نزدیک پاکیزگی تین قسم کی ہوتی ہے، سب سے نچلے درجے پر جسمانی، درمیان میں رُوحانی اور اعلیٰ درجے پر عقلی و علمی، سو اس سے یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ حور و غلمان ایک ہی قانون کے تحت ہیں، اور وہ یہ کہ انہیں اوّل تو جسمِ کثیف سے جسمِ لطیف میں لایا گیا ہے، جس میں نہ تو خون ہے اور نہ کسی قسم کی رطوبت و آلائش، اور ان کی رُوح کو خدا کے بزرگ نام سے واقف و آگاہ کیا ہے اور ان کی عقل کو علم و حکمت سے مانوس کر دیا ہے، اور تین قسم کی پاکیزگی انہی تین چیزوں میں ہے موجودہ جسم سے نُورانی جسم میں منتقل کر دینا، عبادت کے لئے اسمِ بزرگ کا عطیہ اور خصوصی علم و حکمت، یہ جسمانی، رُوحانی اور عقلی پاکیزگی ہے۔

شروع سے لے کر یہاں تک جو کچھ حقائق و معارف بیان ہوئے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ رُوح یقیناً ایک انتہائی پیاری حقیقت ہے، یہ کسی شک کے بغیر آیاتِ قدرت کا سنگم ہے، اِس کے اندر جا کر دیکھنے کے لئے چشمِ بصیرت کی انتہائی ضرورت ہے، اجسام، ارواح اور عقول بجُزوی کی مجرّد حقیقتیں سرچشمۂ عقل میں ایک ہیں، خُدا نے کائنات کو گوہرِ عقل سے بنایا، یعنی گوہرِ عقل میں جس طرح اشیاء کی علمی صُورتیں تھیں، ان کو رُوحانیت اور مادّیت کا ایک ایک لباس پہنا دیا، دوزخ بھی اور بہشت بھی منزلِ مقصود کے راستے میں حائل ہیں، اِنسان کی سب سے آخری منزل گوہرِ عقل اور کلمۂ باری یعنی مقامِ "کُن" ہے، اور خُدا کی خوشنودی اسی مقامِ اعلیٰ پر ہے۔

خانۂ حِکمت۔ کراچی

۳۰ / اکتوبر ۱۹۸۲ء

"روح — ایک انتہائی پیاری حقیقت" کے مضمون سے متعلق سوالات

۱۔ سوال: اسلام میں چشمِ بصیرت (دل کی آنکھ) کا ہونا کیوں ضروری ہے؟ کیا تقلید سے کام نہیں لیا جا سکتا؟ بصیرت کی اہمیّت کے بارے میں کوئی مثال دیں۔

۲۔ سوال: آیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آیۂ مبارکہ: قُلْ ھٰذِہٖ .... (۱۰۸/۱۲) میں جس بصیرت کا ذکر ہوا ہے، اس سے نبوّت و امامت کا نور مراد ہے؟ اگر یہ حقیقت ہے تو اس کی کوئی دلیل پیش کریں۔

۳۔ سوال: قرآن کہتا ہے کہ: جو شخص اس دُنیا میں چشمِ بصیرت حاصل نہ کر سکے تو وہ قیامت میں بھی اندھا ہی رہے گا اور یہ دُور کی گمراہی کی وجہ سے ایسا ہوگا (۷۲/۱۷)، آپ بتائیں کہ اس میں مرکزی اشارہ کس چیز کی طرف ہے اور گمراہی کا سبب کیا ہے؟

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

۴۔سوال : قرآن کی دو سب سے روشن آیتیں : اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ (۲۴/۳۵) اور وَدَاعِیاً تا سِرَاجاً مُّنِیْراً (۳۳/۴۶) ہیں، کائنات کی دو سب سے تابان آیتیں سورج اور چاند، اور عالمِ شخصی کی دو ایسی آیتیں عقل اور رُوح ہیں، تو کیا یہ بھی دُرست ہے کہ عالمِ دین کی دو سب سے عظیم آیتیں رسُولؐ اور امامؑ ہیں ؟

۵۔ یہ ارشاد کس کا ہے : مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ اور اس کے معنی و مقصد کیا ہے ؟

۶۔ کتابِ سماوی کی آیات خاموش و ساکن ہیں، کائنات کی آیات خاموش ہیں مگر ساکن نہیں، یعنی حرکت میں ہیں، اب آپ ہی بتائیں کہ اس کے بعد آیات کی کونسی قسم باقی رہ گئی یعنی انسانی رُوح میں جو آیات ہیں وہ کس نوعیت کی ہو سکتی ہیں ؟ کیا اس میں زندہ اور گویندہ آیات ہیں ؟ زندہ اور گویندہ (بولنے والی) آیات، یعنی معجزاتِ ناطقہ، جو قرآن کی زبان میں آیاتِ بیّنات ہیں (۲۹/۴۹)

۷۔ اِنسان کو کمزور کیوں بنایا گیا ؟ اِس میں کیا مصلحت و حکمت ہے ؟

۸۔ دو دریاؤں کے سنگم سے کیا مُراد ہے ؟ حضرت موسیٰؑ کا سفر جو مجمع البحرین کی طرف تھا، وہ رُوحانی سفر تھا یا جسمانی ؟ خضرِ زمانؑ سے کونسی شخصیّت مُراد ہے ؟

۹۔ حدِ قوّت اور حدِ فعل کی الگ الگ تعریف کرو اور یہ بتاؤ کہ کوئی کافر کس طرح بحدِّ قوّت کتابِ مُبین ہو سکتا ہے؟ اس کی مثال کسی ایسے صحابی سے دو، جو پہلے غیر مُسلم ہو، پھر اُس نے اسلام اور ایمان میں درجۂ کمال حاصل کر لیا ہو۔

۱۰۔ سوال: کوئی مومن نورِ ہدایت اور قرآن میں کس طرح فنا ہو سکتا ہے؟ اِس فنا کا طریق کار کیا ہے؟

۱۱۔ سوال: رُوح کی مثال اِس ظاہری دُنیا کی کسی چیز سے دے کر سمجھائیں کہ رُوح ایک بھی ہے اور لا تعداد بھی، کیا آپ پانی سے رُوح کی بعض حقیقتیں سمجھا سکتے ہیں؟ یعنی دُنیا بھر کے پانی سے۔

۱۲۔ سوال: دراصل معرفت رُوح کی ہے یا پروردگار کی؟ یا دونوں کی؟ آیا رُوح (جبکہ اِس سے رُوحِ اعظم مُراد ہے) اور ربّ میں کوئی خاص رشتہ ہے یا کوئی وحدت ہے؟

۱۳۔ سارے بنی آدم خواہ مومن ہوں یا کافر بابا آدمؑ کی ہستی میں ایک تھے، اب اِس حقیقت کا رُخ اِس طرح ہے کہ پھر آخر میں جا کر تمام بنی نوعِ اِنسان آدم جیسی ایک عظیم ہستی میں جمع ہو جائیں گے، تو کیا یہ وحدتِ ارواح کی ایک واضح مثال ہے؟

۱۴۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ گوہرِ عقل قلمِ الٰہی ہے جو مُلک بھی اور ملکوت بھی کہ وہ عقلی دُنیا ہے اور عقلی صُورت میں اُس میں ہر ہر چیز موجُود ہے، اور وہاں آپ اور ہم یعنی ہر شخص ازلی و ابدی طور

پر موجود ہے، تو پھر یہ آنے اور جانے کا حکم کیا ہے؟

۱۵۔ کیا یہ درست ہے یا نہیں کہ خدا کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ ایک نہیں بلکہ دو پر مبنی ہے؟ چنانچہ ہر انسان کی دو انائیں ہیں، ایک انائے علوی جو ہمیشہ سے ہے اور دوسری انائے سفلی جو کبھی ہے اور کبھی نہیں؟

۱۶۔ جسم، روح اور عقلِ جزوی یہ چیزیں خدا کے حضور تک پہنچ نہیں سکتی ہیں، مگر عین الیقین کا آخری مرتبہ وہاں تک رسا ہو سکتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟ یا آپ کو کچھ کہنا ہے؟

۱۷۔ قیامت کے دن کائنات خدا کی مٹھی میں ہوگی، آیا یہ بات تصوّرِ جسمانی ہے یا تصوّرِ روحانی یا تصوّرِ علمی و عقلی ہے؟ کیونکہ بہت سے لوگوں پر زندگی میں یا مر کر قیامت گزر چکی ہے، مگر اس کائنات کو مادّی طور پر اب تک کچھ نہیں ہوا، یہ ایسی ہی قائم ہے جیسی شروع میں تھی۔

۱۸۔ مدارجِ مخلوق کی چار سیڑھیاں کون کون سی ہیں؟ کیا ان میں سے ہر سیڑھی کے بہت سے زینے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو مثال دے کر سمجھا دیں۔

۱۹۔ سوال: حلال جانور کی روح بوقتِ ذبح نکل کر کہاں جاتی ہے؟ کیا یہ درست ہے کہ یہی روح جو بہت سے ذرّات پر مشتمل ہے متعلقہ لوگوں سے متسلک ہو جاتی ہے؟ کیونکہ اس کا رُخ عالمِ

اِنسان کی طرف ہے، جس طرح رُوحِ نباتی کا رُخ عالمِ حیوان کی جانب ہے۔

۲۰۔ سوال: جمادات، نباتات اور حیوانات کے لئے جبری فنا مقرّر ہے، اور انسان کے لئے کون سی فنا ہے؟ جبری ہے یا اختیاری یا دونوں؟ اگرچہ دُوسری مخلوق کو جبری فنا میں فائدہ ہی فائدہ ہے، لیکن اِنسان کو اختیار دیا گیا ہے، لہٰذا اسے عِلم وعمل اور حقیقی فرمانبرداری سے اختیاری فنا کی سخت ضرورت ہے۔

۲۱۔ کارخانۂ جگر اور کارگاہِ دل کی یہ اہمیّت کیوں ہے؟ انسان میں تیسرا اور چوتھا کارخانۂ حیات کہاں کہاں واقع ہیں؟ اور ان چاروں کا ربط وسِلسِلہ کس طرح ہے؟

۲۲۔ کیا آپ سُورج کی مثال پیش کر کے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ مونوریالزم (یک حقیقت) کا درجہ یعنی نُورِ امامت رُوحوں کا سورج ہے، جس میں جتنی رُوحیں داخل ہیں، اُن سب کی اپنی اپنی انفرادیت بھی ہے، وہ مُساوی بھی ہیں اور اُن میں بلے مثال یک رنگی اور وحدت بھی ہے؟

۲۳۔ اِنّمَا المؤمنون اِخوۃٌ، والانبیاءِ کنفسٍ واحِدۃ۔ یہ ایک حدیث شریف ہے، اور اس میں دو قرآنی ٹکڑے ہیں تو بتائیے کہ وہ دو ٹکڑے کون کون سے ہیں؟ اور اصل حدیث کا ٹکڑا کیا ہے؟ اور اس حدیث کے معنی وتشریح کیا ہے؟

۲۴۔ اگر ہمارا تصوّر یہ ہو کہ آخر کار خدا کی بے پناہ رحمت سے سب لوگ بہشت میں ملنے والے ہیں، ہر چند کہ بعض لوگ بہت پہلے وہاں پہنچ چکے ہوں گے اور کچھ لوگ دیر سے جائیں گے، یا جیسا بھی فرق ہو، وہ ضروری ہے، تو کیا یہ ہماری نظریاتی اور علمی وسیع القلبی ہو سکتی ہے؟

۲۵۔ حور و غلمان اگر جنّتیوں کے ملازم ہیں، یعنی کنیزیں اور غلام، تو قانونِ رحمت کا دوسرا مرحلہ یوں ہونا چاہیئے کہ ان کو آزادی ملے، اور آزادی نہیں مل سکتی جب تک کہ یہ لوگ اُس علم کو حاصل نہ کریں جو اہلِ ایمان کے پاس ہے، اور اگر مان لیا جائے کہ حور و غلمان کو اہلِ ایمان سے علم مل جاتا ہے اور وہ آزاد ہو کر درجات پر فائز بھی ہو جاتے ہیں، تو پھر کیا اس سے مومنین کی رونق میں کمی واقع ہوگی؟

خانۂ حکمت۔ کراچی

۵۔ نومبر سنہ ۱۹۸۲ء